www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2018 ، قیمت :-/10₹

ماھنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 6 شمارہ: 12 دسمبر 2018

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل ـ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبہ ادارت: 49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون: 26109746
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجدیہ رجنگ کمپلکس
بلاک نمبر 1-5، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
مضامین	ڈاکٹر چندر شیکھر وینکٹ رمن	احرار حسین	07
	بڑھتی ہوئی آبادی کا دھماکہ	انصاری ثنا کوثر عتیق الرحمن	10
	تتلیوں کی دنیا	محمد اعجاز	13
	ہاکی کے جادوگر: میجر دھیان چند	طوبیٰ ایوب	16
نظمیں	جنگل	وکیل نجیب	19
	شہیدِ اعظم بھگت سنگھ کے نام	کوثر بھگوت پوری	20
کھیل اور کھلاڑی	ایشیائی کھیلوں میں چین	سید پرویز قیصر	21
کہانیاں	ایک انکر دو پتے	شیریں نیازی	23
	خدا نیت دیکھتا ہے	پرویز شہریار	27
نظمیں	ایک کہانی	فاطمہ شاہین	31
	آدابِ گفتگو	مظہر الاسلام	32
	نہ پانی کو تم کرنا برباد بچو	محمد وکیل	32
کہانیاں	بجلی کا جھٹکا دینے والی	جاوید نہال حشمی	33
	چوں چوں کی آواز	ایم رحمن	37
باتصویر کہانی	زرین	قاسم خورشید	38
قسط وار	شہر میں جنگل	کمارن ست سیوم	42
کہکشاں	اتحاد	محراج الدین	51
	والد	شیخ فہد عبدالموحد	52
	پھلواری کا شوق	آصفیہ خان	53
	عرشیہ کی گڑیا	حارث انصاری	54
	اچھی باتیں	تبسم بی سید عقیل	55
	حضرت علیؓ کی پیاری باتیں	محمد ثاقب محمد عارف	55
	روشن سطریں	اویس اختر انصاری	56
	سنہری باتیں	نازنین محمد انس باغوان	56
ننھے فنکار	عقل مند راجا	معاذ راجے صاحب قادر بھائی	59
	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی باتیں	اردو فیس بک		62

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! دسمبر کا شمارہ حاضر ہے۔ جس وقت یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا اس وقت تک سردیاں شروع ہو چکی ہوں گی۔ سردی کا موسم بھی لطف دینے والا ہوتا ہے۔ جیکٹ، شال اور رنگ برنگے سوئٹروں کو پہننے کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں ہمیں مختلف موسموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ورنہ دنیا کے بہت سارے ممالک ایسے ہیں جہاں سال بھر صرف سردیاں ہی ہوتی ہیں اور انھیں پورے سال شدید ٹھنڈک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سردیوں میں جہاں صحت بخش پھل وغیرہ کھانے میں لطف آتا ہے وہیں گلاب اور چنبیلی جیسے خوشنما پھولوں کی بہار بھی اسی موسم میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ سردی میں کھانے پینے پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اِس موسم میں ہاضمہ درست رہتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھالیا جائے اور پیٹ کی مختلف بیماریوں کو دعوت دی جائے۔ ملک کے بہت سارے علاقے ایسے ہیں جہاں سیکڑوں لوگ سردی کی وجہ سے اپنی جان بھی گنوا دیتے ہیں۔ آپ سب بھی سردیوں میں اپنا خیال رکھیں۔ ساتھ ہی اپنے آس پاس کے غریب لوگوں کا بھی۔ اپنے پرانے گرم کپڑوں سے ان کی مدد کریں تاکہ وہ بھی سردی سے لطف اندوز ہو سکیں۔

دسمبر میں بہت سارے اسکولوں میں اینڈ سمسٹر امتحانات بھی ہوتے ہیں اور کچھ مہینوں بعد بورڈ کے امتحانات بھی منعقد ہوں گے تو یہ مہینہ اپنے سال بھر کے پڑھے ہوئے مواد کا جائزہ لینے کا بھی ہے کہ آپ نے سال بھر میں کیا کیا پڑھا اور کیا یاد رکھا اور اب آگے آپ کو کیا پڑھنا ہے، کیا کرنا ہے۔ اپنے مقاصد کا جائزہ لیں اور ہدف کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جائیں۔ آپ میں سے بہت سارے بچے جو مالی طور پر کمزور ہیں ان کے لیے حکومت ہند مختلف پروگرام اور اسکیمیں بھی چلاتی ہے۔ اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ پری میٹرک، پوسٹ میٹرک اور میرٹ کم مینس اسکالرشپ، نیا سویرا فری کوچنگ اسکیم، لڑکیوں کے لیے مولانا آزاد اسکالرشپ، پڑھو پردیس اسکیم، استاد اسکیم، مولانا آزاد نیشنل اکیڈمی فار اسکل، نئی منزل، ٹیچر لٹن نو ائلٹ اسکیم، کستور با بالیکا ودھیالیہ جیسی اسکیم اور پروگراموں سے آپ سب طلبا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان اسکیموں کی جانکاری آپ اقلیتی وزارت اور وزارت ترقی انسانی وسائل کی ویب سائٹ پر حاصل کر سکتے ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ تعلیم و تربیت پر اپنی پوری توجہ مرکوز کریں گے اور تعلیم کو صرف اپنی ذات، خاندان، علاقے تک محدود نہیں رکھیں گے بلکہ علم کی شمع ہر جگہ روشن کریں گے کیونکہ جب تک علم کا اجالا ہر طرف نہیں پھیلے گا ہمارے ملک اور معاشرے سے اندھیرا دور نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی ہوگی کہ جو لوگ تعلیم سے دور ہیں انھیں تعلیم سے جوڑیں تاکہ ہم ایک تعلیم یافتہ اور مہذب معاشرہ بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔ یہی ہمارا بنیادی فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی ہم سب کے لیے لازمی ہے۔

اب آپ بچوں کی دنیا کا مطالعہ کریں۔ اپنے تاثرات سے آگاہ کرنا نہ بھولیں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

ادب اطفال کے فروغ میں تخلیقی وتنقیدی ادب کے شانہ بہ شانہ رسائل و جرائد کا اہم رول رہا ہے۔ادب اطفال کی اسی اہمیت کے پیش نظر اردو میں بچوں کے کئی اہم اور موقر رسالے تواتر سے شائع ہو رہے ہیں جیسے 'بچوں کی دنیا'، 'امنگ' اور 'گل بوٹے' وغیرہ وغیرہ۔ان رسائل میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے شائع ہونے والا رسالہ 'بچوں کی دنیا' (ماہنامہ) صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں مقبول ہے۔اس کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ اس میں پیش کردہ مواد کا بچوں کی نفسیات اور ان کی سطح کے مطابق ہونا ہے۔ معنوی خوبیوں کے علاوہ رسالے کی صوری خوبیاں بھی اس کی مقبولیت کی ایک وجہ ہے، خاص طور پر باتصویر کہانیاں رسالے کے اغراض و مقاصد سے بخوبی ہم آہنگ ہیں۔علاوہ ازیں یہاں مفید اور کارآمد معلومات کی پیش کش سے بچوں کی دلچسپی اور تجسس کو برقرار رکھنے کا اہم کام بھی لیا جاتا ہے۔

جولائی مہینے کا تازہ شمارہ اپنی تمام تر خوبیوں اور کمالات سے آراستہ میرے سامنے ہے۔64 صفحات پر مشتمل یہ رسالہ کیفیت وکمیت ہر دو لحاظ سے ہماری توجہ کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ مستقل کالم 'آپس کی باتیں' کے تحت ماحولیاتی تبدیلی کے اہم موضوع کو بے تکلف انداز میں پیش کرتے ہوئے اس کے مہیب اور خطرناک اثرات سے بچوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔'بچوں کی دنیا' میں کہانیوں، نظموں، قسط وار ناول، کھیل اور کھلاڑی کے شانہ بہ شانہ معلوماتی مضامین اور بچوں کے خصوصی کالم یعنی 'فیس بک، کہکشاں، ننھے فن کار اور ننھے قلم کار بھی ہیں۔مشمولات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں بچوں کی سطح اور ان کی نفسیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔وہ کہانیاں ہوں یا پھر نظمیں یا پھر دیگر مضامین ان میں بچوں کی نفسیات اور ان کی طبائع کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔یوں تو سارے مضامین عمدہ ہیں، خاص طور پر احرار حسین کا لیزر سرجری، شعیب عالم قاسمی کا 'ٹیلی گرام کیوں ضروری ہے؟' اور حمید ادیبی ناندوری کا مضمون 'چھوٹے لوگ بڑے کارنامے' کافی مفید اور کارآمد ہیں۔جاوید مجیدی، ابرار اعظمی اور ستار فیضی کی نظمیں بھی بہت عمدہ ہیں اور بچوں کی ذہنی سطح کا خصوصی خیال رکھتے ہوئے کہی گئی ہیں۔

رسالے کا اہم پہلو بچوں کے خصوصی کالم فیس بک، کہکشاں، ننھے فن کار اور ننھے قلم کار ہیں جن کا مقصد معلومات کی افزائش کے ساتھ ساتھ بچوں میں تحریر، تنظیم، ترتیب اور تزئین جیسی صلاحیتوں کو فروغ دینا ہے۔بچوں کے لیے مختص رسالوں میں اس طرح کے گوشوں سے بچوں کی ذہنی وفکری تربیت میں کافی مدد ملتی ہے۔بچوں کی فطری صلاحیتوں کو صیقل کرنا اور انھیں مناسب مواقع فراہم کرکے ان میں اعتماد پیدا کرنا 'بچوں کی دنیا' کا قابل ذکر پہلو ہے۔غرض 'بچوں کی دنیا' کہانی، نظم، کھیل کھلاڑی، خصوصی کالم، قسط وار ناول وغیرہ کا ایسا خوب صورت مرقع ہے جس کی رنگینی ورعنائی دلوں کو خوب بھاتی ہے اور نظروں کو سرور عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر توشاد عالم، اکادمی برائے فروغ استعداد، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'بچوں کی دنیا' نہایت عمدہ رسالہ ہے۔ اس میں شائع شدہ مضامین معلومات افزا ہیں، خصوصاً سائنسی مضامین قابل مطالعہ ہوتے ہیں۔ کہانیاں بھی دلچسپ ہوتی ہیں۔ قسط وار ناول 'زمین کی تہہ میں' مترجم 'شکیل صدیقی' کا تحریر کردہ خیالی دنیا سے دور اور حقیقت سے قریب معلوم ہوتا ہے۔

سیمیں کئی، I-B-28، پوسٹ کتھارا، ضلع بوکارو، بہار

جولائی کا 'بچوں کی دنیا' موصول ہوا اور ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی یہ رسالہ دلآویز اور قابل ستائش ہے۔ اس شمارے کے تمام مشمولات مع تصاویر نہایت دلکش ہیں جن کو پڑھنے کے بعد کوئی نہ کوئی سبق ضرور حاصل ہوتا ہے اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، صرف بچوں کے لیے ہی نہیں معلومات کے اعتبار سے یہ بڑوں کے لیے بھی کارآمد رسالہ ہے۔ پیج کور دیدہ زیب ہے۔ امید ہے یہ رسالہ اسی طرح قارئین کی توجہ کا مرکز بنا رہے گا۔

سفینہ بیگم، بلاسپور، رامپور، اترپردیش

کل کی صبح میرے لیے بہت خوش آئند رہی ہے کیونکہ سرحد پار سے میرے لیے دو ادبی پھول آئے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے اتنے اچھے رسالے مجھے ارسال کیے ہیں۔

مجیب اوٹھو قاضی احمد، سندھ پاکستان

ماہِ رواں کا ماہنامہ نظر نواز ہوا۔ پڑھ کر کافی مسرت ہوئی کہ اردو کے ساتھ ساتھ بچوں کی All round development پر خصوصی کوشش جاری وساری ہے۔ اس رسالے سے گنگا جمنی اتحاد کی شعائیں بھی پھوٹ رہی ہیں جو وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور آپ کی یہ کاوش قابل صد مبارکباد ہے۔

قدیر عشرت قادری، سینئر انگریزی صحافی، راویر ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

ترنگا کے رنگ میں رنگا ہوا 'بچوں کی دنیا' اگست 2018 کا شمارہ موصول ہوا۔ مضامین، کہانیاں اور کہکشاں جیسے کالموں کے تحت تمام تخلیقات دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ 'بھارت کی شان' اور 'ہندوستان ہمارا' جیسی چھوٹی نظموں نے اپنے اندر یوم آزادی کی تاریخ اور اس کے پیغام کو سمو لیا ہے۔ 'آپ کا دماغ کتنا تیز ہے' والا کالم دماغی ورزش کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ میری دونوں بیٹیوں طوبیٰ اور امانی نے تصاویر کے اندر غلطیوں کو نکالا اور صحیح جواب دیا۔

'آپ کی باتیں' میں مدیر محترم نے جنگ آزادی میں اردو زبان کے کردار کو مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ میرے خیال میں اگر اردو کو روزگار سے جوڑ دیا جائے تو اس زبان کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد قطب الدین، ایسوسی ایٹ پروفیسر، عربی، جے این یو، نئی دہلی

'بچوں کی دنیا' کا اکتوبر 2018 کا شمارہ بدست ہے۔ ماضی کے شماروں کی طرح بچوں کے لیے ڈھیر ساری سوغات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ سبھی مضامین، کہانیاں، نظمیں اور معلوماتی کالم سے رسالہ مزین ہے۔ خاص طور پر اس شمارے میں 'جشن مہاتما گاندھی' سرورق سے شروع ہوکر گاندھی کا بچپن، گاندھی جی کا چشمہ، گاندھی جی کی عظمت، گاندھی جی کا خواب، گاندھی جی افریقہ میں، مہاتما گاندھی کے لیے، بابائے قوم مہاتما گاندھی، گاندھی جی، صفائی کا تحفہ، گاندھی جی کی جھلک، تین اقرار صفحہ 30 تک پھیلا ہے۔ گاندھی جی کی زندگی اچھی طرح پیش کی گئی ہے، جس میں آپ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

افتخار انیس حمیدی، 194، چہ امروہہ، یوپی

'بچوں کی دنیا' ستمبر 2018 کے شمارے میں اپنا مضمون 'میرے استاد: عبدالحمید سر' دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی جس کے لیے آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

صبا منیر، مولانا آزاد کالج، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

احرار حسین

ڈاکٹر چندر شیکھر وینکٹ رمن

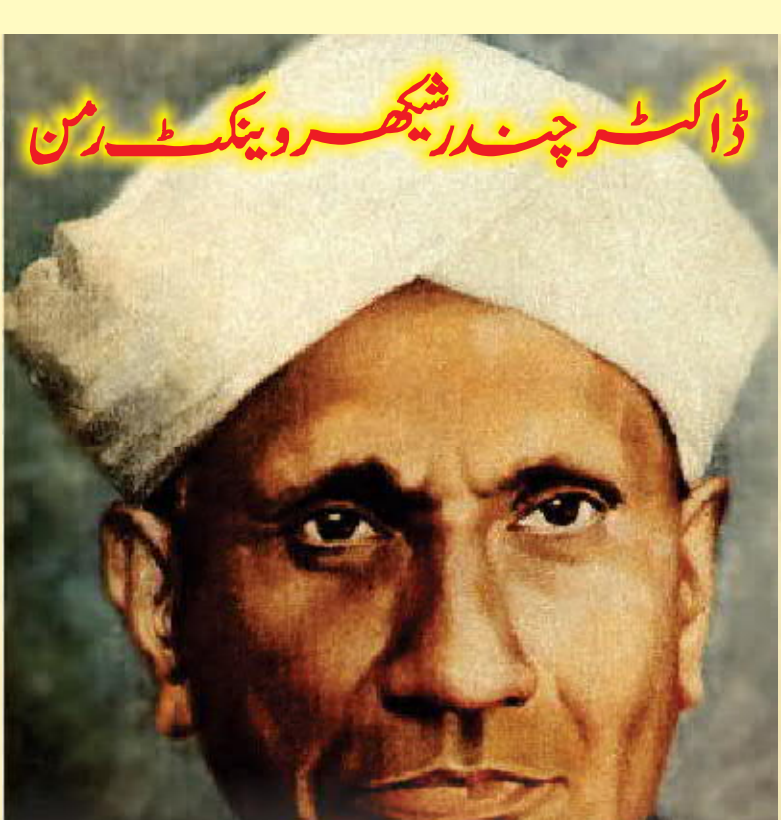

28 فروری کو ہمارے ملک میں قومی سائنسی ڈے منایا جاتا ہے۔ 1928 میں اس دن چندر شیکھر رمن نے رمن افیکٹ کی کھوج کی تھی۔ جس کے لیے ان کو بعد میں نوبیل انعام سے نوازا گیا تھا۔ آج تک رمن اکیلے ایسے ہندوستانی سائنس داں ہیں جنھیں ہندوستان میں کیے گئے سائنسی کاموں میں نوبیل انعام ملا۔

چندر شیکھر وینکٹ رمن کی پیدائش 7 نومبر 1888 کو مدراس کے قریب ورچنا پلی میں ہوا۔ آپ کے والد صاحب حساب اور طبیعیات کے استاد تھے۔ رمن کی زندگی پر ان کے والد صاحب کا کافی اثر پڑا۔ 1901 میں رمن پریسیڈینسی کالج مدراس میں داخل ہوئے۔ انھوں نے مدراس یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور اس کے بیرونِ ملک جا کر سائنسی تحقیقات میں لگ گئے لیکن حالات نے اجازت نہ دی۔ رمن صاحب نے بہت سارے مضامین بھی لکھے جو اس وقت مختلف میگزین میں چھپے۔ اس سے ان کی سائنس میں گہری دلچسپی ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد وہ رمن انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ سروس شعبہ میں اپنے کام میں مصروف ہوگئے لیکن ان دنوں بھی ان کا دل ہمیشہ سائنسی تحقیقات میں لگا رہا تھا۔ اس لیے جب بھی ان کے پاس خالی وقت ہوتا تو وہ ریسرچ کے کاموں میں لگ جاتے۔

رمن اپنا سائنسی تحقیقاتی کام انڈین ایسوسی ایشن فار کلٹی ویشن آف سائنس اور شعبہ طبیعیات کلکتہ یونیورسٹی میں کیا کرتے تھے۔ رمن نے جب ایسوسی ایشن میں اپنا کام شروع کیا، اس وقت انھیں ایک اور سائنس داں ملے جن کا نام آشوتوش ڈے تھا۔ ان کے بھی قومی اور عالمی سائنس میگزین میں 30 سے زیادہ مضامین چھپ چکے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ مضامین رمن اور آشوتوش نے مشترکہ طور پر لکھے۔ 1921 میں کلکتہ یونیورسٹی میں رمن صاحب نے کے۔ آر۔ نارائنن کے

ساتھ مل کر روشنی کے بکھراؤ پر ریسرچ کی۔ اسی دوران ان کی ملاقات سر آشوتوش مکرجی سے ہوئی۔

سر آشوتوش مکرجی کی صلاح پر رمن 1921 میں ہی پہلی بار انگلینڈ گئے۔ دورانِ سفر انھوں نے جہاز کے ڈیک پر کھڑے ہوکر آسمان پر نظر ڈالی تو وہ سوچنے لگے کہ یہ آسمان نیلا نظر کیوں آتا ہے۔ جواب کی تلاش میں وہ لگ گئے۔ رمن کی ریسرچ کو سمجھنے کے لیے ہمیں روشنی کے بکھراؤ کے بارے میں جاننا ہوگا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی جب بھی مخروط سے گزاری جاتی ہے تو ہمیں ریفریکٹڈ روشنی ملتی ہے جس میں سات رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سات رنگ مختلف لہروں سے بنتے ہیں۔ اس ہر رنگ کی ایک فری کوئنسی ہوتی ہے۔

آشوتوش مکرجی رمن کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اس وقت کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اس یونیورسٹی میں سر تارک ناتھ پلیت چیر کے لیے مکرجی صاحب ایک باصلاحیت شخص کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے وینکٹ رمن کو اس عہدے کے لیے بہتر جانا اور اس طرح رمن 29 سال کی عمر میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس عہدے پر انھوں نے 1932 تک کام کیا اور اس کے بعد بنگلور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے ڈائرکٹر ہوکر بنگلور آ گئے۔ 1951 میں انھوں نے بنگلور میں ہی رمن انسٹی ٹیوٹ کا سنگ بنیاد رکھا اور وہ زندگی کے آخری لمحے تک اس انسٹی ٹیوٹ میں مصروف رہے۔

اگر ہم کسی بھی فری کوینسی کی روشنی کو کسی گیس سے گزار دیں تو باہر نکلنے والی روشنی کی فری کوینسی بکھراؤ کے بعد اگر بدلتی نہیں ہے تو وہ ریلی اسے اسکیٹرنگ کے نام سے جانی جاتی ہے لیکن اس اسکیٹرنگ کے اندر ایک راز پنہاں تھا جو رمن کی تیز نظر سے نہ چھپ سکا۔ اسے بعد میں رمن افیکٹ کے نام سے جانا گیا۔ رمن جب اپنی تجربہ گاہ میں اسپیکٹرو اسکوپ پر کام کر رہے تھے تو انھیں یہ پتہ چلا کہ جب ایک رنگ کی روشنی کو بکھرایا جائے تو باہر نکلنے والی روشنی میں لائنوں کے علاوہ کچھ اور لائنیں بھی موجود تھیں۔ جن کی فری کوینسی ری فریکٹڈ لائٹ سے کم یا زیادہ تھی۔ اس کام کو رمن اور ان کے ساتھیوں نے

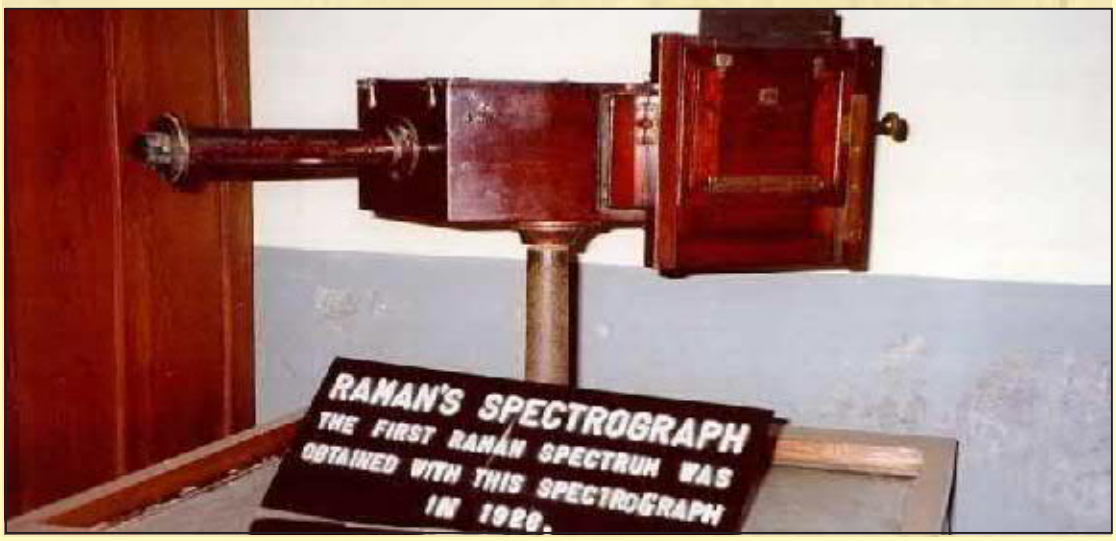

بہت دھیان سے مطالعہ کیا اور انھوں نے روشنی کو مختلف رقیق مادوں سے، گیسوں سے اور کرسٹلس سے بکھرا کر دیکھا اور اسپیکٹرم ریکارڈ کیے۔ اس کام پر رمن کو نوبیل انعام ملا۔ اسے ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

$$hw'+E' = hw+E$$
$$hw' = hw+E-E'$$
$$W' = h + \frac{E-E'}{h}$$

جب E<E ہوتا ہے تو اسپیکٹرم پر جو فری کوینسیز ملیں گی انھیں اسٹروکس لائن کہتے ہیں۔ جب E>E' ہوگا تو اسپیکٹرم میں جو لائنیں حاصل ہوں گی وہ این۔ ٹی۔ اسٹروکس لائنیں کہلاتی ہیں۔ عام طور سے یہ لائنیں بہت ہلکی ہوتی ہیں لیکن جب درجہ حرارت بڑھاتے ہیں تو ان لائنوں کی شدت بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح رمن نے مختلف گیسوں، رقیق مادوں اور کرسٹلو سے روشنی کو بکھرانے پر یہ پایا کہ

$$W'-W = + W'$$

ہوتا ہے۔ اس فری کوئنسی کو رمن فری کوئنسی کہتے ہیں۔ اس اعلیٰ پیمانے کے تحقیقاتی کاموں کی وجہ سے مولی کیولر اسپیکٹرو اسکوپی میں نئے نئے کام ہونے لگے ہیں۔ مولی کیولر اسپیکٹرو اسکوپی کے حساب سے مولی کیولس کی تین طرح کی اسٹیٹس ہوتی ہیں۔

(1) الیکٹرانک انرجی (2) اسپین انرجی (3) روٹیشنل انرجی اسٹیٹس جب کسی مولی کیول پر روشنی ڈالی جاتی ہے تو اس کی ان تینوں قوتوں پر اثر پڑتا ہے اور اگر اہم مولی کیولس کا اسپیکٹرم ریکارڈ کریں تو ہمیں ان کی اندرونی بناوٹ کے بارے میں جانکاری ملتی ہے۔ اس شعبے میں آج بھی دنیا بھر میں ریسرچ کے کام چل رہے ہیں۔

ماخذ: سائنسی شعاعیں، مصنف: ڈاکٹر احرار حسین، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

انصاری ثنا کوثر عتیق الرحمن

مضمون

بڑھتی ہوئی آبادی کا دھماکہ

بڑھتی ہوئی آبادی دنیا کے لیے ایک مسئلہ بن چکی ہے۔ آج اس وقت دنیا کی آبادی تقریباً 7.6 بلین ہو چکی ہے۔ آبادی کے اضافے میں چین پہلے نمبر پر ہے اور بھارت دوسرے نمبر پر ہے۔ ہمارے ہندوستان کی آبادی تقریباً 125 کروڑ سے زیادہ ہے۔ امریکہ جیسے Super Power ملک کی آبادی 42 کروڑ ہے۔ آج بڑھتی ہوئی آبادی کے دھماکے کی وجہ سے ہندوستان میں غذائی اجناس میں کمی اور مختلف چیزوں میں دشواری آرہی ہے۔ اس کے برخلاف Super power امریکہ میں تمام انسانوں کو زیادہ فیسیلٹی ملتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے دس ہزار سال پہلے دنیا کی آبادی 5 ملین تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد دو سو ملین تھی۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے 1000 سال بعد دنیا کی آبادی 300 ملین، 1750 میں 800 ملین، 1850 میں 1000 ملین، 1930 میں 2000 ملین، 1962 میں 3000 ملین، 1975 میں 4000 ملین، 1978 میں 5000 ملین، 1999 میں 6000 ملین اور 2012 میں 70,000 ہزار ملین آبادی تھی۔

انسانی تاریخ کی ابتدا میں آبادی کا اضافہ بہت ہی کم تھا لیکن بعد کے زمانے میں انسان نے شکار، زراعت، غذا کی تیاری وغیرہ میں مہارتیں حاصل کیں۔ ضروری غذاؤں کی فراہمی کی بنا پر شرح پیدائش میں اضافہ ہوا اور ان تمام کے اثرات اضافۂ آبادی پر ظاہر ہوئے۔

پندرہویں اور سولہویں صدی میں اضافۂ آبادی کے نقطۂ نگاہ سے بہت اہمیت کی حامل قرار دی گئی۔ کیونکہ اسی زمانے میں آبادی میں اضافہ ہوا لیکن زندگی غیر معیاری تھی۔ شرح پیدائش اور شرح اموات دونوں ہی زیادہ تھے۔ بار بار آنے والے سیلاب و قحط اور جنگ کی وجہ سے غذائی پیداوار بھی اچھی نہیں رہی۔ مختلف وبائی امراض کا پھیلاؤ ہوا۔ ان تمام اثرات کی بنا پر قدرتی طور پر آبادی میں کمی ہوئی۔ بیسویں صدی میں نہایت قلیل مدت میں آبادی میں اضافہ ہوا۔ خاص کر کے یہ اضافہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ طبی سہولتوں کی وجہ سے عام لوگوں کی صحت اور معیارِ زندگی بہتر ہوئی۔ اکیسویں صدی میں عام طور پر کسی بھی ملک میں آبادی ایک اہم حرکی قوت کے وسائل کے طور پر پہچانی جا رہی ہے۔ انسانوں کے ذریعے ہی کسی بھی علاقے کی معاشی ترقی کی جاسکتی ہے۔

حال ہی میں ریسرچ کرنے والوں نے بتایا ہے کہ زمین موجودہ آبادی کے دو لاکھ گنا زیادہ آبادی کا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔ ہمارے جسم سے نکلنے والی گرمی کا اوسط ناپ کر انھوں نے یہ عدد طے کیے ہیں اور ہماری آبادی 1.3 لاکھ عرب ہوگئی تو زمین پر ہونے والی گرمی سے زندہ رہنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ساڑھے 6 عرب آبادی یا اس سے زیادہ آبادی کا بوجھ اٹھانے کی طاقت اس زمین میں ہے۔ 20 سال پہلے UNO نے اندازہ لگایا تھا کہ 2050 میں ہماری آبادی 11.16 ارب ہوجائے گی۔ وہ آبادی موجودہ آبادی سے دوگنی زیادہ ہے۔

اگر کسی ملک میں لوگ بھکمری (فاقہ) کا شکار ہو رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں غذا کی کمی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دنیا میں رہنے والے لوگ غذا خرید نہیں پائیں گے۔

مختلف نظریہ: کم آبادی کے بارے میں سوچو بہتر زندگی بسر کرو:

آج دنیا کی آبادی تقریباً 7.6 بلین ہے۔ ہندوستان کی آبادی کی بات کریں تو ایک چوتھائی لوگ جھونپڑیوں میں رہ رہے ہیں۔ اس طرح سر چھپانے کے لیے ان کے پاس محفوظ مکان بھی نہیں ہے۔

آنے والے چند سالوں میں آبادی کے دھماکے کی وجہ سے لوگ غذا نہیں خرید پائیں گے۔ جس طرح کئی سالوں پہلے ہم موبائل فون، ٹی وی، لیپ ٹاپ نہیں خرید پاتے تھے۔ اسی طرح آنے والی زندگی میں انسانوں کے لیے ٹیکنالوجی سستی ہوگی اور کھانا مہنگا ہوگا۔ کوئی امیر آدمی ہی غذا خرید کر کھائے گا۔ 2050 کے بعد زمین سے اناج کی پیداوار کم ہوگی۔ پلاسٹک اور

دوسرے کیمیکل کو ملا کر اناج بنائیں گے جو صحت کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ NASA میں سائنس داں ایک ایسی دوا بنانے کے لیے ریسرچ کر رہے ہیں جو انسانوں کی بھوک مٹاتی ہو۔ اس میں تمام پروٹین موجود ہوں جن سے انسان کی گروتھ ہو اور وہ زندہ رہے۔

ہمیں جتنا ممکن ہو سکے ایسے حالات کو روکنا چاہیے۔ کسی سائنس داں نے زمین پر بڑھتی ہوئی آبادی کو سمانے کے لیے دو ہزار منزلہ عمارت کے بارے میں بتایا ہے۔ اس طرح تنگ جگہ میں رہنے کی وجہ سے چاہے گھر میں، راستے میں یا کسی سواری میں اپنی زندگی ہمیں اکڑ کر یا بھیڑ میں ہی گزارنی ہوگی۔ آج کے زمانے میں اگر ایک بس میں تقریباً 200 لوگ سفر کرتے ہیں تو 2050 کے بعد اسی بس میں سے 2 سے 3 ہزار سے زیادہ لوگ سفر کریں گے۔ آبادی کی وجہ سے اتنی پریشانی آئے گی۔

ہمارے استعمال یا کام کی جگہ جہاں پر ہم مکان تعمیر کر سکتے ہیں۔ وہاں پر سورج کی روشنی آنے میں دقت آئے گی۔ اپنے کام کی جگہ پر سفر کے وقت میں اضافہ ہو جائے گا۔ ہم کو ہمیشہ غیر قدرتی روشنی کا سہارا لینا پڑے گا۔ ہماری دنیا انسانوں کی دنیا لگنے کی بجائے چونٹیوں، مونگوں کی دنیا لگے گی۔ آنے والے وقت میں ناموں کے بجائے ہر شخص کو نمبر سے یاد رکھا جائے گا۔ اس لیے ہماری قوتِ فکر میں کمی آئے گی اور مستقبل میں غزالی، ارسطو، افلاطون، شیکسپیئر، پکاسو، رومی، حافظ شیرازی، میر تقی میر، مرزا غالب، علامہ اقبال، مولانا آزاد جیسے بڑے بڑے ادبا، شعرا اور مفکرین پیدا نہیں ہوں گے۔

■

Ansari Sana Kausar Ateequrrehman
NH-3, High Way Road ,Behind Police
Chowki, Dhule - 424001 (Maharashtra)

جوابات

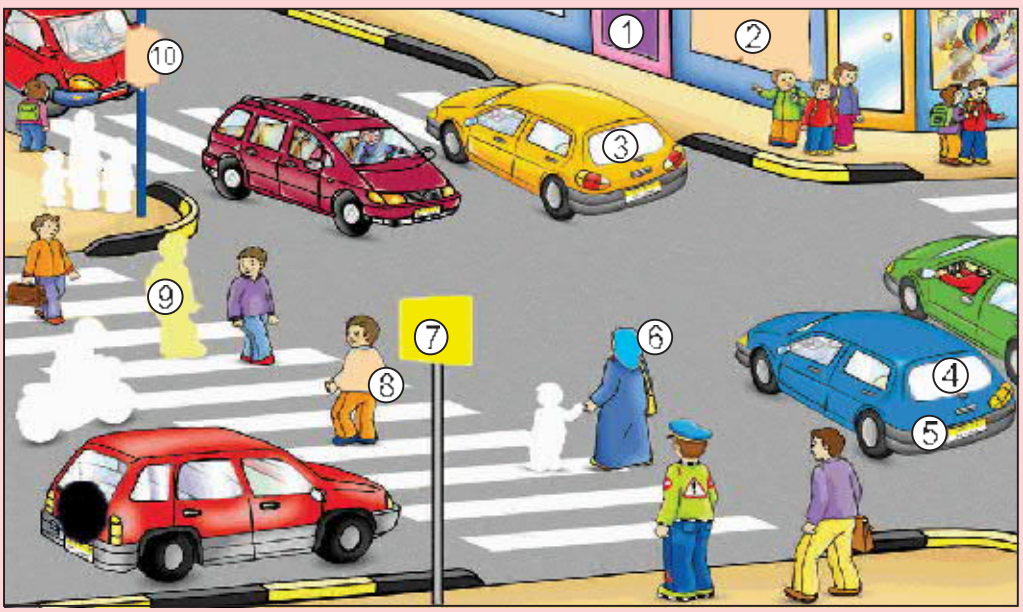

محمد اعجاز

تتلیوں کی دنیا

پیارے بچوں! تتلی دنیا کے نہایت خوب صورت جانداروں میں سے ایک ہے۔ جب یہ پھولوں پر بیٹھی ہوتی ہے تو اس کی خوبصورتی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہ پارکوں اور باغوں کی زینت ہے۔ آپ جب وہاں جاتے ہوں گے تو بہت سی تتلیاں دیکھتے ہوں گے۔ یہ وہاں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ اڑتی ہوئی ہمارے گھروں میں آجاتی ہیں۔ موسم بہار میں ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ یہ پھولوں پر خوب منڈلاتی اور اٹھلاتی ہیں۔ اس موسم میں یہ جھنڈوں میں اڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں لیکن آپ ایک بات یاد رکھیں کہ انھیں زیادہ ٹھنڈی جگہ راس نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ آئس لینڈ میں تتلیاں نہیں پائی جاتیں ہیں۔

تتلیوں کے متعلق لوگوں کے خیالات مختلف ہیں۔ جاپان کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اگر تتلی کسی کے ڈرائنگ روم میں بانس کی بنی ہوئی کسی چیز پر بیٹھ جائے تو کسی پسندیدہ انسان کی آمد ہوگی۔ کچھ لوگ تو انھیں پُنر جنم (مرنے کے بعد دوسرے جسم میں پیدا ہونا) کی علامت بھی مانتے ہیں۔ تتلیاں صدیوں سے مصوروں اور فن کاروں کے لیے باعث کشش رہی ہیں۔ کپڑے، زیورات اور فن پاروں کی خوبصورتی کو بڑھانے کے لیے انہیں نقش کیا جاتا ہے۔

تتلیوں کی کئی نسلیں ہیں اور اسی بنیاد پر ان کے رنگ روپ ایک دوسرے سے تھوڑے مختلف ہوتے ہیں۔ ویسے اب تک ان کی 1500 سے زیادہ نسلوں کا پتہ لگایا جا چکا ہے۔ ان کے پنکھ ان کی نسلوں کی بنیاد پر مختلف رنگوں کے یا دھاری دار ہوتے ہیں۔ پنکھوں کے اوپر اور نیچے کے ڈیزائن بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ویسے ان کے جسم کے تین اہم حصے ہوتے ہیں۔ سر، سینہ اور پیٹ۔ دو آنکھیں، دو پنکھ اور چھ پیروں کے علاوہ ان کی زبان بھی ہوتی ہیں۔ ان کا جسم گرچہ پتلا ہوتا ہے لیکن ان کے پنکھ بہت بڑے ہوتے ہیں۔

تتلیوں کی نسلوں کے مطابق ان کی اپنی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی تتلی New Guinea کی Queen Alexandra's Birdwing ہے۔ ان کے پنکھوں کا پھیلاؤ 12 انچ تک ہوتا ہے۔ جہاں تک دنیا کی سب سے چھوٹی تتلی کا سوال ہے وہ Western Pygmy Blue ہے جو ویسٹرن امریکا میں پائی جاتی ہے۔ ان کے

پنکھوں کا پھیلاؤ 0.5 انچ سے لے کر 0.75 انچ تک ہوتا ہے۔ سائنس دانوں نے تتلیوں کی ایک ایسی قسم کی تلاش کی ہے جس سے کستوری کی گندھ آتی ہے۔ اسے Delias Butterfly hyparete indica نام دیا گیا ہے۔ کچھ تتلیوں کے جسم سے چندن جیسی مہک بھی آتی ہے۔

تتلیاں مہاجر بھی ہوتی ہیں یعنی ایک جگہ سے سفر کر کے دوسری جگہ جانے والی۔ موسم میں تبدیلی ہونے پر ان کے جھنڈ کے جھنڈ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر کے چلے جاتے ہیں۔ سردیوں میں مونارک تتلیاں سفر کر کے میکسیکو کی کھاڑی میں پہنچ جاتی ہیں اور وہیں اپنا وقت گزارتی ہیں۔ سخت سردی میں یہ گرم آب و ہوا کی جانب کوچ کر جاتی ہیں اور موسم بہار میں دوسرے مقامات پر چلی جاتی ہیں۔ ہر سال ان کا یہی سلسلہ رہتا ہے۔

تتلیاں خود بھلے ہی مختلف رنگوں کی ہوں لیکن رنگ پہچاننے کی صلاحیت کچھ ہی نسلوں میں ہوتی ہے۔

تتلیوں کا اپنا ایک علاقہ ہوتا ہے جس میں وہ کسی دوسرے گروہ کی تتلیوں کے داخلے کو ناپسند کرتی ہیں۔ اگر باہری تتلیاں وہاں آجائیں تو یہ اسے کھدیڑ دیتی ہیں۔

یہ جان کر آپ کو یقیناً تعجب ہوگا کہ تتلیوں کو تمام سمتوں میں دیکھنے کی صلاحیت ہے یعنی اوپر نیچے، آگے پیچھے، دائیں بائیں، سبھی سمتوں میں دیکھ سکتی ہیں۔ تتلیاں لمبی دوری تک بھی اڑ سکتی ہیں۔ سورج کے ذریعے یہ سمت کا پتا لگاتی ہیں۔

اڑنا کوئی تتلیوں سے سیکھے۔ اڑنے میں یہ بڑی ماہر ہوتی ہیں۔ اڑتے وقت یہ ایسی قلابازیاں کھاتی ہیں کہ مت پوچھو یعنی سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے اپنے تئیں الٹا کر دیتی ہیں۔ ان کا ہوا میں تیرنا، چھلانگ لگانا، کافی اونچائی تک اڑنا اور پھدکنا یہ ساری باتیں حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔

تتلیاں عقل مند اور سمجھ دار ہوتی ہیں۔ ان کا دماغ بہت

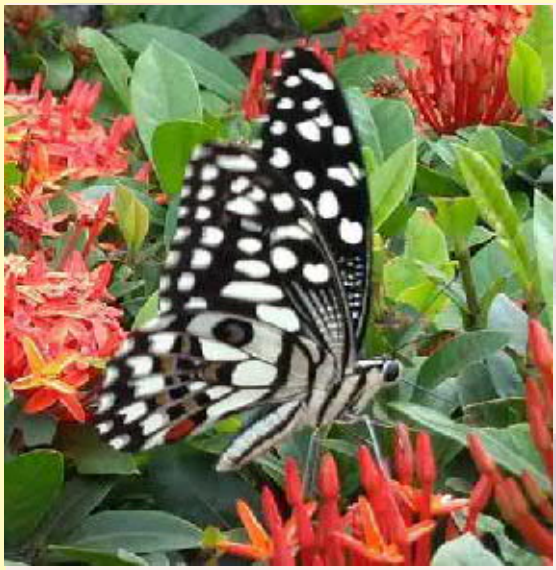

تیز، سرگرم اور حساس ہوتا ہے۔ ان کی ذہانت کا یہ حال ہے کہ بالغ ہونے پر بھی یہ اس جگہ کو نہیں بھولتیں جہاں ان کی زندگی کی شروعات ہوئی تھی۔ ان کے دیکھنے، سونگھنے اور پہچاننے کی صلاحیت زبردست ہوتی ہے۔ اپنے antenna (بعض کیڑے مکوڑوں کے سر پر لگے ہوئے محاسوں کی جوڑی میں سے کوئی جن میں چھونے، چکھنے وغیرہ کی حس ہوتی ہے) کی وجہ سے کسی چیز کی مہک کو معلوم کر لیتی ہیں۔

تتلیاں دن کے وقت پھولوں پر منڈلاتی ہیں اور اندھیرا ہونے پر آرام کرتی ہیں۔ آرام کرتے وقت ان کے دونوں پنکھ آپس میں جڑ کر پیٹھ کے اوپر سیدھے کھڑے رہتے ہیں۔

تتلیاں پھولوں کا رس پی کر زندہ رہتی ہیں۔ یہ مکمل طور پر سبزی خور ہوتی ہیں۔ بھارت میں جھارکھنڈ کے جمشید پور میں Tata Steel Zoological Park کے تحت تتلیوں کا ایک باغ بھی ہے جس میں کئی قسموں کی خوب صورت تتلیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سیاح ان کو دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا تتلی فارم اسٹیٹ-Startford Upon- Avon Butterfly Farm انگلینڈ میں ہے جس میں 800 مربع میٹر میں ہزاروں کی تعداد میں تتلیاں ہیں۔ اسے 1985 میں قائم کیا گیا تھا۔

تتلیوں کی زندگی کی شروعات انڈے سے ہوتی ہے۔ مادہ تتلیاں اپنے انڈے پتوں پر دیتی ہیں جو الگ الگ بھی ہوسکتے ہیں اور گچھے کی شکل میں بھی۔ ہر انڈے میں ایک caterpillar لاروا نکلتا ہے جو لگاتار پتے کھا کر بڑا ہوتا ہے۔ پورے طور پر بڑھنے کے بعد caterpillar پیوپا (pupa کسی کیڑے کے پہلے روپ کے بعد کی حالت) میں بدل جاتا ہے۔ اس پیوپا کے اندر تتلی اپنی شکل اختیار کرنا شروع کرتی ہے۔ پوری شکل حاصل کر لینے کے بعد وہ پیوپا کا اوپری خول توڑ کر ایک تتلی بن کر باہر نکل جاتی ہے۔

تتلیوں کے قدرتی دشمن بھی ہوتے ہیں۔ دشمنوں سے تحفظ کی خاطر وہ آس پاس کے ماحول کے مطابق رنگ اور سائز اختیار کر لیتی ہیں تاکہ وہ ان کی نظر سے بچی رہیں۔

انسان بڑا خودغرض ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے معصوم تتلیوں کی جان لے لیتا ہے۔ اس کے علاوہ کھیتوں اور باغیچوں میں کیڑے مار دواؤں کے چھڑکاؤ سے بھی تتلیاں مر جاتی ہیں۔ تتلیوں کے بچانے کی ذمہ داری ہم سبھوں کی ہے۔ آیئے ہم اس بات کا عہد کریں کہ ہم ان کی حفاظت کریں گے اور ان کی خاطر زیادہ سے زیادہ پیڑ پودے لگائیں گے۔

■

Md Ajaz
Raja Tola Harlakhi, P.O. Harlakhi
Via - Umgaon Kothi
Madhubani, Bihar 847240

طوبیٰ ایوب

مضمون

ہاکی کے جادوگر
میجر دھیان چند

ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں گھر آنا اور دادا دادی کے ساتھ وقت بتانا بہت اچھا لگتا ہے۔ آم، لیچی اور جامن جیسے پھل شہر میں بھی ملتے ہیں۔ ہم خرید کر کھاتے بھی ہیں۔ لیکن اپنے باغ سے آئے ہوئے آموں کا کیا کہنا۔ تازے میٹھے آم اور وہ بھی بغیر کیمیکل کے پکائے ہوئے۔ دادا جان روز فجر کی نماز کے بعد گھر آتے، چائے ناشتہ کرتے اور اپنی چھڑی اٹھا کر کہیں نکل جاتے۔ دادا جان پچاسی سال کے ہو چکے ہیں لیکن روزانہ پانچ کیلو میٹر واک کرتے ہیں۔ صبح کی سیر کرتے ہوئے اپنے کھیتوں اور باغات کی طرف جاتے ہیں۔ میں نے ضد کی کہ دادا جان آپ کے ساتھ میں بھی چلوں گی تو دادا جان فوراً مان گئے۔ پھر تو یہ روز کا معمول ہو گیا۔ دادا جان صبح کی سیر کو نکلتے تو میں ساتھ ہو لیتی۔

میرے ابو نے بتایا تھا کہ دادا جان اپنے زمانے میں ہاکی کے مشہور کھلاڑی تھے۔ ایک دن صبح کی سیر سے لوٹتے ہوئے دادا جان ایک میدان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے کہ بیٹا میں جب اسکول میں پڑھتا تھا تو اسی میدان میں ہاکی کھیلا کرتا تھا۔ پھر تو ہاکی کی بات نکل پڑی۔ دادا جان پہلے اسکول، پھر کالج اور یونیورسٹی اور پھر اسٹیٹ کی طرف سے ہاکی کھیل چکے تھے۔ وہ نہ صرف ہاکی کے اچھے کھلاڑی رہے تھے بلکہ ہاکی کے بارے میں ان کی جانکاری بہت زیادہ تھی۔ اس دن صبح کی سیر سے لوٹتے ہوئے میں نے پوچھا کہ دادا جان آپ تو اسٹیٹ لیول ہاکی کھلاڑی رہے ہیں۔ آپ کا پسندیدہ ہاکی کھلاڑی کون ہے؟

میجر دھیان چند۔ دادا جان فوراً بول پڑے۔ پھر انھوں نے ذرا ٹھہر کر بتانا شروع کیا۔ دیکھو بیٹا، ہاکی ہمیشہ سے ہمارے ملک میں مقبول ترین کھیل رہا ہے۔ اس ملک میں ہاکی کے کئی مایہ ناز کھلاڑی پیدا ہوئے۔ کے ڈی سنگھ بابو، ظفر اقبال، پرگٹ سنگھ، محمد شاہد، آر پی سنگھ، دھن راج پلّئی جیسے ہاکی کھلاڑیوں پر ملک کے ہر باشندے کو فخر ہے۔ مگر دھیان چند کی بات ہی کچھ اور تھی۔

دادا جان، دادا جان، دھیان چند کی بات ہی کچھ اور تھی سے کیا مطلب ہے؟ آپ دھیان چند کے بارے میں کچھ بتائیں نا!

اچھا تو سنو! دادا جان بولے۔

ہاکی کے جادوگر کے نام سے مشہور میجر دھیان چند 29 اگست 1905 میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی الہ آباد

ہے جو سنگم، امرود اور اکبر الہ آبادی کے لیے مشہور ہے۔

دادا جان، دادا جان، کیا سنگم امرود جیسا کوئی پھل ہے؟

میری اس بات پہ دادا جان خوب زور سے ہنسے۔

ارے نہیں بیٹا۔ تم نے گنگا اور جمنا ندی کا نام تو سنا ہوگا۔

جی دادا جان، جب میں ابو امی کے ساتھ بنارس گئی تھی تو ہم شام میں اسّی گھاٹ گھومنے گئے تھے۔ وہاں ہم نے آرتی بھی دیکھی۔ بہت خوبصورت منظر تھا۔ اور جمنا ندی تو ہم اکثر دیکھتے ہیں۔ دہلی میں جب ہم میٹرو میں سفر کرتے ہیں تو کئی مرتبہ میٹرو ٹرین جمنا ندی کے پُل سے گزرتی ہے۔ دہلی میں ایک میٹرو اسٹیشن کا نام بھی 'یمنا بینک' ہے۔

خیر تو تم ہمارے ملک کی دو اہم ندیوں گنگا اور جمنا سے واقف ہو۔ الہ آباد میں یہ دونوں ندیاں آپس میں ملتی ہیں۔ جہاں یہ ندیاں آپس میں ملتی ہیں، اس جگہ کو 'سنگم' کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک تیسری ندی 'سرسوتی' بھی اس سنگم پہ ملتی ہے۔ سنگم ایک مقدس مقام ہے۔ ہر سال یہاں لاکھوں لوگ سنگم پر اشنان کرنے آتے ہیں۔

اور اکبر الہ آبادی؟

اکبر الہ آبادی اردو کے ایک مشہور شاعر تھے۔ وہ اردو شاعری میں طنز و مزاح کے بادشاہ کہلاتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے دادا جان رُک گئے۔

خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ورنہ ہم اکبر الہ آبادی، امرود اور سنگم پر ہی بات کرتے رہ جائیں گے۔ آج تو میں تمھیں ہاکی کے جادوگر میجر دھیان چند کے بارے میں بتاؤں گا۔ تو سنو! اتنا تو تمھیں معلوم ہو گیا کہ دھیان چند الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سمیشور سنگھ نے ان کا نام دھیان سنگھ رکھا تھا۔ لیکن وہ دھیان چند کے نام سے مشہور ہوئے۔ چونکہ وہ فوج میں بھرتی ہو گئے تھے اور ترقی کر کے میجر کے عہدے پر پہنچے تھے اس لیے ہم سبھی انھیں میجر دھیان چند کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کی والدہ کا نام شردھا اور والد کا نام سمیشور سنگھ تھا۔ ان کے والد بھی فوج میں تھے اور فوج کی طرف سے ہاکی کھیلتے تھے۔ ان کے دو سگے بھائی تھے۔ روپ سنگھ اور مول سنگھ۔ روپ سنگھ بھی اپنے زمانے کے مشہور ہاکی کھلاڑی تھے۔ ابتدا میں دھیان چند کی دلچسپی کشتی میں تھی، ہاکی کھیلنا انھیں زیادہ پسند نہیں تھا۔ لیکن محض 16 سال کی عمر میں جب وہ فوج میں بھرتی ہوئے تو ہاکی کھیلنے میں ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ رفتہ رفتہ اس دلچسپی نے جنون اور دیوانگی کا روپ اختیار کر لیا۔

دادا جان، جب والد صاحب نے ان کا نام دھیان سنگھ رکھا تھا تو پھر ان کا نام دھیان چند کیسے ہو گیا؟

اس کی بھی بڑی دلچسپ کہانی ہے بیٹا۔

ہوا یوں کہ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد دھیان سنگھ دن میں ڈیوٹی کرتے تھے۔ ہاکی کی پریکٹس کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ پریکٹس کے بنا کوئی بھی کام میں ماہر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے دھیان سنگھ رات میں پریکٹس کرنے کے لیے ہاکی کے میدان میں چلے جاتے تھے اور چاند کے نکلنے کا انتظار کرتے تھے۔ جب چاند نکلتا تو دھیان سنگھ چاند کی ہلکی روشنی میں ہاکی کھیلنے کی پریکٹس کرتے تھے۔ اس زمانے میں بجلی کے بڑے بڑے بلب نہیں تھے کہ رات میں بھی دن جیسا اُجالا ہو جائے۔ کبھی کبھی چاند دیر سے نکلتا اور دھیان سنگھ میدان کے کنارے بیٹھے چاند نکلنے کا انتظار کرتے رہتے۔ ان کے ساتھی کھلاڑی کہتے کہ چلو آج بنا پریکٹس کیے گھر واپس چلتے ہیں۔ تو دھیان سنگھ بغیر پریکٹس کیے گھر واپس جانے سے منع کر دیتے اور چاند نکلنے کا انتظار کرنے لگتے۔ تم کو معلوم ہے کہ چاند

کو ہندی میں چندرما اور چند بھی کہتے ہیں۔ یہیں سے دھیان سنگھ کے ساتھی ان کو دھیان چند کہنے لگے۔ اور پھر دھیان چند ہاکی کی دنیا میں نام روشن کرنے والے کھلاڑی بنے۔

اولمپک میں کھیلنا کسی بھی کھلاڑی کی زندگی کا سپنا ہوتا ہے۔ اور اولمپک میں میڈل جیتنا تو اور بھی بڑا سپنا ہوتا ہے۔ اور جب کوئی کھلاڑی اپنے ملک کے لیے اولمپک میں سونے کا تمغہ یعنی گولڈ میڈل جیت لے تو پھر کیا کہنے۔ میجر دھیان چند نے اولمپک میں تین بار گولڈ میڈل حاصل کیا۔ سنہ 1928 میں نیدرلینڈ کے شہر ایمسٹرڈم میں اولمپک میچ ہوا۔ ہندوستانی ہاکی ٹیم نے اولمپک میں پہلا گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اس ٹورنامنٹ میں سب سے زیادہ چودہ گول دھیان چند نے کیے تھے۔ نیدر لینڈ کے اخبارات نے لکھا کہ یہ ہاکی کا میچ نہیں تھا جادو تھا۔ اور یہ کہ دھیان چند نام کا ہاکی کھلاڑی جادوگر ہے۔

سنہ 1932 کے اولمپک میں ہندوستان کا پہلا میچ جاپان سے ہوا۔ ہندوستانی ٹیم نے اس پہلے میچ میں جاپان کے خلاف ریکارڈ گیارہ (11) گول کیے جن، میں تین گول اکیلے دھیان چند نے کیے۔ اس اولمپک کے فائنل میچ میں ہندوستان کی ٹیم کا مقابلہ میزبان امریکا کی ٹیم سے ہوا۔ اس میچ میں ہماری ٹیم نے امریکی ہاکی ٹیم کو کس بری طرح ہرایا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتی ہو کہ ہمارے کھلاڑیوں نے کل چوبیس (24) گول کیے، جبکہ امریکی ہاکی ٹیم محض ایک گول کر سکی۔ ان چوبیس گولوں میں آٹھ گول دھیان چند نے اور دس گول ان کے بھائی روپ سنگھ نے کے تھے۔ اس طرح امریکا سے بھی ہماری ہاکی ٹیم گولڈ میڈل لے کر واپس آئی۔ اس کے بعد 1936 میں جرمنی کے شہر برلن میں اولمپک کھیل کا انعقاد ہوا۔ اس مرتبہ ہندوستانی ہاکی ٹیم کے کپتان میجر دھیان چند تھے۔ برلن میں بھی ہندوستانی ہاکی ٹیم نے اپنی جیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ فائنل میچ میں مقابلہ میزبان جرمنی سے تھا۔ جرمنی کی ہاکی ٹیم کو اسی کے میدان پر ہرانا بہت مشکل کام تھا۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے ٹیم کے مینیجر پنکج گپتا نے دھیان چند، جعفر، روپ سنگھ اور علی دارا کو ایک کمرے میں بلایا اور انھیں ترنگا جھنڈا دکھا کر کہا کہ ہمیں اس جھنڈے کی شان کے لیے کھیلنا ہے۔ پھر کیا تھا، میجر دھیان چند کی ٹیم نے جرمنی کی ہاکی ٹیم کو آٹھ گول سے ہرا دیا۔ اس میں تین گول خود میجر دھیان چند نے کیے تھے اور ایک بار پھر گولڈ میڈل پر ہمارا قبضہ ہوا۔

میجر دھیان چند نے اپنے کیریئر میں چار سو سے زیادہ گول کیے۔ 1956 میں وہ فوج سے میجر کے عہدے سے رٹائرڈ ہوئے۔ رٹائرمنٹ کے بعد راجستھان کے ماؤنٹ آبو میں وہ ہاکی کوچنگ کیمپ سے وابستہ رہے۔ وہ انڈین ہاکی کے کوچ بھی رہے۔ انھیں حکومت ہند کی جانب سے پدم بھوشن کا اعزاز بھی ملا تھا۔ ان کی یوم پیدائش یعنی 29 اگست کو ملک بھر میں قومی یوم کھیل (National Sports Day) کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اسی دن راشٹرپتی بھون میں راجیو گاندھی کھیل رتن ایوارڈ، درونا چاریہ ایوارڈ اور ارجن ایوارڈ وغیرہ دیے جاتے ہیں۔ دہلی میں نیشنل اسٹیڈیم کا نام دھیان چند ہاکی اسٹیڈیم رکھا گیا ہے۔ ملک میں اور بھی کئی مقامات کے نام دھیان چند کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ ہاکی کے جادوگر کے نام سے مشہور اس عظیم کھلاڑی کا انتقال 3 دسمبر 1979 کو ہوا۔

■

Tooba Ayub
Flat No . 304 - B ,
Susheel Suhag Building No. 367/ B - 1
Near Pal Dairy, Munirka ,New Delhi - 110067

وکیل نجیب

جنگل

ہزاروں جھاڑیوں کا گھر ندی پہاڑیوں کا گھر
حسین سبزہ زار ہیں عظیم کوہسار ہیں
چرند ہیں پرند ہیں ہزارہا درند ہیں
وہ تتلیوں کے قافلے وہ رنگ برنگ سلسلے
سب اپنے آپ میں مگن ہر اک کو ہے کوئی لگن
ہر اک طرف بہار ہے خمار ہی خمار ہے
رواں دواں ہے آبجو نہ جانے کیا ہے جستجو
کرن کرن میں روشنی لہر لہر میں دلکشی
ہری بھری ہیں ڈالیاں بجا رہی ہیں تالیاں
ہرن کے جھنڈ اس طرف تو قمریاں ہیں اس طرف
ترنگ ہی ترنگ ہے امنگ ہی امنگ ہے
نہ گرد نہ غبار ہے خدا کا شاہکار ہے
یہ حسن بے مثال ہے جمال ہی جمال ہے
فضاؤں میں سکون ہے اداؤں میں جنون ہے
یہ چھوٹے چھوٹے جانور پھدک رہے اِدھر اُدھر
عجیب رنگ و روپ ہے نہ سایہ ہے نہ دھوپ ہے
عجیب سا سنگھار ہے یہ دڑ زرنگار ہے
یہ رنگ و نور کا شہر بدل رہا ہے ہر پہر
فضا میں زندگی یہاں ہوا میں نغمگی یہاں
ندی میں جو حباب ہے وہ مثل آفتاب ہے
گلہریوں کی دھوم ہے پرند کا ہجوم ہے
یہ زندگی کی ابتدا یہ زندگی کا ارتقا
یہ جھرنا ہے وہ جھیل ہے حیات کی دلیل ہے
ہزاروں ان میں مچھلیاں کبھی یہاں کبھی وہاں
یہ چھوٹے آبی جانور سفر کریں اِدھر اُدھر
عجیب سا ہے یہ چمن چنبیلی، موگرا، سمن
ہزاروں بوٹیاں یہاں صحت کی جو ہیں رازداں
خدا نے اس زمین کو بنایا کتنے پیار سے
یہ خوشنما حسیں نگر سجایا کتنے پیار سے
اسی سے رونق زمیں اسی سے موسم حسیں
اسی سے یہ بہار ہے زمیں کا یہ وقار ہے
یہ بن ہماری شان ہے یہ بن ہماری جان ہے
یہ جنت زمین ہے یہ زینتِ زمین ہے
زمیں کا سائبان ہے یہ امن کا نشان ہے
سکون یہ بنا رہے کہ رنگ یہ جما رہے
یہ بن یونہی سجا رہے کہ حال یہ بنا رہے
درخت نہ کٹیں کوئی نہ جھاڑیاں چھٹیں کوئی
اگر یہ بن اجڑ گیا مزاج گر بگڑ گیا
بگاڑ موسموں کا ہے کہ خوف آندھیوں کا ہے
یہ موسموں کا ہے زیاں وناش اس میں ہے نہاں
اسے بچانا ہے تمھیں اسے سجانا ہے تمھیں
مجھے یقیں ہے دوستو اے میرے ننھے ساتھیو
لڑو گے اس کے واسطے بڑھو گے اس کے واسطے
کہ رکھنا ہے سنبھال کے یہ اگلی نسلوں کے لیے
اسے بچانا ہے تمھیں اسے سجانا ہے تمھیں
حفاظت ان کی تم کرو محبت ان سے تم کرو
یہی تمہارا فرض ہے یہ فرض تم نبھاؤ گے
یہی تو تم پہ قرض ہے
یہ قرض تم چکاؤ گے

■

Wakeel Najeeb
Near Lal Urdu School
Mominpura
Nagpur - 440018 (Maharashtra)

کوثر بھگوت پوری

شہیدِ اعظم بھگت سنگھ کے نام

سردار بھگت سنگھ زندہ ہو
ہر سانسوں میں پائندہ ہو
ہم اہلِ وطن کے سینے کی
ہر دھڑکن میں تابندہ ہو
ہر بچے کی مسکانوں میں
ہر اک ماں کے ارمانوں میں
ہر گلشن میں کاشانوں میں
ہر اک کھیتوں کھلیانوں میں
ہر سمت سے آتی جاتی ہوا
ہر اُور گرجتی مست گھٹا
تیری ہی باتیں کرتی ہے
جمہور کی ہر اک فکر و ادا
تیری ہی یاد دلاتی ہے
جو کوئل گیت سناتی ہے
جو بلبل نغمے گاتی ہے
وہ بھی تو بات اشاروں میں
آزادی کی سمجھاتی ہے
وادی وادی صحرا صحرا
جنگل جنگل دریا دریا
پنچھی جو اڑانیں بھرتے ہیں
خاموش زبانوں میں وہ بھی
تیرے ہی چرچے کرتے ہیں

تیری ہی فکر کی تصویریں
کھیتوں کھیتوں ہریالی ہے
تیری ہی قربانی کا پھل
ہر خوشہ ہر اک بالی ہے
تیرے جذبوں کی بخشی ہوئی
ہر اک ہونٹوں کی لالی ہے
سردار بھگت سنگھ زندہ ہو
ہر شعبے ہر میدانوں میں
محنت کرتے مزدوروں میں
ہر اک شہر و ویران میں
سرحد پہ کھڑے جوانوں میں
محنت سے لڑتے ہر لمحہ
مٹی میں سنے کسانوں میں
تیرے بارے میں پڑھ پڑھ کر
اک پل نہ چین سے سوئے تھے
الفاظ میں لانا ناممکن
ہم تجھ میں کتنا کھوئے تھے
جو تجھ پہ جور و ستم ٹوٹے
یہ جان کے آزادی کی قسم
ہم خون کے آنسو روئے تھے
آزادی کے پروانوں میں
سرمست ادا دیوانوں میں

کیا وہ تیرا جذبہ تھا
سچی آزادی کی خاطر
تم نے نہ کیا کیا سوچا تھا
زیرِ زنداں تنہائی میں
تم نے جو کچھ بھی لکھا تھا
ان دستاویز سے خوف زدہ
انگریز کے ظالم حربے تھے
تب تو ان کو نابود کیا
سولی پہ تمھیں نہ جھولے فقط
لاشوں تک کو مسدود کیا
یہ ان کی بظاہر دہشت تھی
وحشیوں کی یہ وحشت تھی
وہ فکر تری وہ خواب ترے
وہ ساتھی وہ احباب ترے
جو ساتھ ترے مصلوب ہوئے
جو سولی کے محبوب ہوئے
وہ لوگ تو اب بھی زندہ ہیں
اس ملک کے ذرہ گلشن میں
ہر کھیت ہر اک گھر آنگن میں
ہر باغ بغیچے اور بن میں
سچے لوگوں کے تن من میں

■

Kausar Bhagwatpuri
At/P.O: Bhagwatpur
Via: Sarai Ranjan
Samastipur-848127(Bihar)

سید پرویز قیصر

ایشیائی کھیلوں میں چین کی بالادستی برقرار

انڈونیشیا کی راجدھانی جکارتہ میں ہوئے 18ویں ایشیائی کھیلوں میں جس نے 132 طلائی، 92 نقرئی اور 65 کانسہ کے تمغوں کے ساتھ پہلا مقام حاصل کیا۔ اس نے لگاتار دسویں مرتبہ پہلا مقام ضرور حاصل کیا مگر اس کی یہ کارکردگی چار سال قبل آنچیون میں ہوئے ایشیائی کھیلوں کے مقابلے خراب رہی۔ تب اس نے کل 345 تمغے حاصل کیے تھے جس میں 151 طلائی، 109 نقرئی اور 85 کانسہ کے تمغے شامل تھے۔

اٹھارہویں ایشیائی کھیلوں کے مقابلے جکارتہ کے علاوہ پالمبانگ میں بھی ہوئے۔ یہ دوسرا موقع تھا جب انڈونیشیا میں ایشیائی کھیل منعقد ہوئے۔ اس سے پہلے 1962 میں چوتھے ایشیائی کھیل منعقد ہوئے تھے۔ اس مرتبہ میزبان انڈونیشیا نے 31 طلائی، 24 نقرئی اور 43 کانسہ کے تمغے جیتے۔ وہ کل 98 تمغوں کے ساتھ ان کھیلوں میں چوتھے مقام پر رہا۔ جو اس کی ایشیائی کھیلوں میں تمغوں کے اعتبار سے سب سے اچھی کارکردگی ہے۔ اس سے پہلے 1962 میں اس نے 51 تمغوں کے ساتھ دوسرا مقام حاصل کیا تھا جو اس کی ایشیائی کھیلوں میں پچھلی سب سے اچھی کارکردگی تھی تب اس کے کھلاڑیوں نے گیارہ طلائی، 12 نقرئی اور 28 کانسہ کے تمغے جیتے تھے۔ جب تک چین ایشیائی کھیلوں میں شرکت نہیں کرتا تھا تب جاپان کو پہلا مقام ملتا تھا مگر چین اور جنوبی کوریا کے کھلاڑیوں کی اچھی کارکردگی نے جاپان کو پہلے مقام حاصل کرنے سے روک دیا تھا۔ جب ایشیائی کھیل جنوبی کوریا میں ہوئے تب اس نے جاپان کو تیسرے مقام پر دھکیل دیا تھا۔

اس مرتبہ جاپان کے کھلاڑیوں نے 205 تمغوں کے ساتھ دوسرا مقام حاصل کیا۔ اس کے کھلاڑیوں نے 75 طلائی، 56 نقرئی اور 74 کانسہ کے تمغوں کے ساتھ دوسرے مقام پر قبضہ جمایا۔

جنوبی کوریا نے 49 طلائی، 58 نقرئی اور 70 کانسہ کے

ایشیائی کھیلوں میں شریک ممالک کی کارکردگی
(پہلے سے دسویں نمبر تک)

	ملک	طلائی	نقری	کانسہ	کل
.1	چین (1)	132	92	65	288
.2	جاپان (3)	75	56	74	205
.3	جنوبی کوریا (2)	49	58	70	177
.4	انڈونیشیا (17)	31	24	43	98
.5	ازبکستان (11)	21	24	25	70
.6	ایران (5)	20	20	22	62
.7	تائیوان (9)	17	19	31	67
.8	ہندوستان (8)	15	24	30	69
.9	قزاکستان (4)	15	17	44	76
.10	شمالی کوریا (7)	12	12	13	37

تمغوں کے ساتھ تیسرا مقام حاصل کیا۔

اس مرتبہ جن 45 ملکوں کے 11720 کھلاڑیوں نے 40 کھیلوں کے 465 مقابلوں میں شرکت کی ان میں سے 36 ملکوں کے کھلاڑی کوئی نہ کوئی تمغہ لے کر وطن واپس گئے۔ ان میں سے 29 ملکوں کے کھلاڑی ایک نہ ایک طلائی تمغہ جیتنے میں کامیاب رہے۔

نو ملکوں کے کھلاڑی خالی ہاتھ واپس گئے۔ بھوٹان، برونئی، بنگلہ دیش، مالدیپ، عمان، فلسطین، ایسٹ تیمور، سری لنکا اور یمن کے کھلاڑی ان ایشیائی کھیلوں میں کوئی تمغہ حاصل نہیں کر سکے۔

اس مرتبہ 40 کھیلوں کے مقابل ہوئے تھے۔ اس سے پہلے ایک مرتبہ ایشیائی کھیل میں اس سے زیادہ کھیل ہوئے تھے۔ 2010 میں چین کے شہر گونگترو میں 42 کھیلوں کے مقابلے ہوئے تھے۔

برج کو پہلی مرتبہ ان کھیلوں میں جگہ ملی تھی۔ تاش کے اس کھیل میں ہندوستان کے 60 سالہ کھلاڑی پرنب پردھان نے طلائی تمغہ حاصل کیا اور وہ ان کھیلوں میں طلائی تمغہ حاصل کرنے والے سب سے بڑی عمر کے کھلاڑی رہے۔

ہندوستان کے کھلاڑیوں نے 69 تمغے حاصل کیے جو کسی ایک ایشیائی کھیل میں اس کے سب سے زیادہ تھے۔ ہندوستانی کھلاڑیوں نے 15 طلائی، 24 نقری اور 30 کانسہ کے تمغوں کے ساتھ آٹھواں مقام حاصل کیا۔ گونگترو میں 2010 میں ہوئے ایشیائی کھیلوں میں ہندوستان نے 65 تمغے حاصل کیے تھے جو اس سے پہلے اس کی ایشیائی کھیلوں میں سب سے اچھی کارکردگی تھی۔

جاپان کی تیراک ریکا کوایکی نے چھ طلائی اور دو نقری تمغے حاصل کیے اور ایک ایشیائی کھیل میں سب سے زیادہ تمغے جیتنے کا ریکارڈ برابر کیا۔ 1982 میں نئی دہلی میں ہوئے ایشیائی کھیلوں میں شمالی کوریا نے جن مان سونے آٹھ تمغے حاصل کیے تھے وہ سات طلائی اور ایک نقری تمغے جیتنے میں کامیاب رہے تھے۔

ریکا کوایکی ایشیائی کھیلوں کی سب سے اچھی کھلاڑی منتخب ہوئیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی خاتون کھلاڑی کو ایشیائی کھیلوں میں سب سے اچھا کھلاڑی منتخب کیا گیا۔

نوٹ: گذشتہ ایشیائی کھیلوں کی پوزیشن بریکٹ میں دی گئی ہے۔

■

Syed Pervez Qaiser
1433 Qasim Jan Street
Ballimaran, Delhi - 110006

شیریں نیازی

ایک انکر دو پتّے

سردیوں کی چادر ابھی ابھی سرکی ہی تھی کہ مارچ کا مہینہ دھڑام سے آنگن میں کود پڑا اور وہ بھی جھلساتی دھوپ اور گرم ہوا کے تھپیڑوں کے ساتھ۔ اتنی جلدی ایسی گرمی آجائے گی کسی کو امید نہ تھی۔ ساتھ ساتھ بچوں کے امتحان بھی چلنے لگے تھے۔

آج مُنّن کے امتحان کا آخری پرچہ تھا۔ اسکول بس خراب تھی اور سبھی گارجینوں کو اپنے اپنے بچوں کو اسکول پہنچانا ضروری تھا۔ ورنہ سال بھر کی محنت بیکار ہو جاتی۔

ممی ساری رات مُنن کو پنکھا جھلتی رہی تھیں تاکہ بچے کی نیند پوری ہو سکے۔ ہوا کے جھونکوں سے محلے کے کسی الیکٹرک پول کا تار ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ سارے لوگ مچھروں اور گرمی سے بے حال تھے۔ سب سے زیادہ مصیبت تو ماؤں پر آتی ہے۔ بچے کی نیند کی خاطر خود انھیں ساری رات جاگنا پڑتا ہے اور صبح کا سارا کام بھی انھیں کے ذمے ہوتا ہے۔ بچوں کو تیار کرنا، لنچ کا انتظام کرنا، آفس والوں کو آفس بھیجنے کا انتظام، گھر کے بڑے بوڑھوں کی دیکھ ریکھ، جھاڑو برتن، کپڑے، بریک فاسٹ، لنچ، ڈنر وغیرہ۔

مُنن کی ممی رات بھر جاگنے کے باوجود صبح پانچ بجے سے اپنے کام میں لگ گئی تھیں مگر پاپا کی نیند کھلے نہ کھلتی تھی۔ ممی اپنا کام کرتے کرتے کئی بار انھیں ہلا چکی تھیں۔ لیکن وہ غوں غوں کر کے پھر سو جاتے تھے۔ وقت سرکتا جا رہا تھا۔ ممی کا کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا تھا اگر وقت پر بچہ اسکول نہ پہنچ سکا تو کیا ہوگا؟

اب بات دڈا تک جا پہنچی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ بچے کی فکر سے ان کے ماتھے پر شکنیں بڑھ گئی تھیں اور پسینہ آ رہا تھا۔

”بہو تم جلدی سے چائے لے کر کمرے میں آجاؤ میں اٹھاتی ہوں اسے“

”پھر اماں جی، یہ برش کریں گے تب نہ؟ ورنہ پاپا...“

”ارے بھاڑ میں جائیں تیرے پاپا کے رول اور ریگولیشن۔ آج اس کا موقع نہیں ہے۔ یہ اٹھا ہی نہیں تو برش کہاں سے کر لے گا؟“

”پاپا یعنی کہ مُنن کے دادا جی نے گھر میں ملٹری شاسن لاگو کر رکھا تھا۔ ہر چیز ان کے مطابق ہونی چاہیے۔ سونا جاگنا کھانا

پینا اور کسی کو بھی برش کے بغیر چائے پینے کی اجازت نہیں تھی۔

ممی ڈر رہی تھیں کہ دادا جی کا ملٹری شاسن توڑ دینے کا نتیجہ پورے دن کو خراب کرنا۔

دڈا اڑ گئیں۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے جیسا کہتی ہوں ویسا کرو نہیں تو بچے کا امتحان گیا۔ پھر روتی رہنا سال بھر...

چائے لے کر وہ سیدھی بیٹے کے روم میں گھس گئیں اور سوئے ہوئے بن صاحب جو ابھی بھی خراٹے بھر رہے تھے ان کا منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ دڈا نے چمچ سے ان کے منہ میں چائے ڈال دی...

بن صاحب ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے... ان کی آنکھیں ابھی بند ہی تھیں۔ دیکھا نہیں تھا سامنے کون ہے۔ منن کی ممی سمجھ کر جھنجھلا اٹھے: کیا مذاق ہے بھئی یہ کوئی طریقہ ہے؟؟

''طریقہ تو اب میں تجھ سکھاؤں گی بیٹے۔ تجھے ذرا سا بھی بچے کا خیال ہے کیا۔ بچے کو امتحان دینے جانا ہے اور باپ سویا پڑا ہے۔ کب سے اٹھا رہی ہے بہو تجھے۔ لے اب یہ چائے ختم کر اور جلدی سے تیار ہو جا۔

منہ ہاتھ دھوتے دھوتے بن صاحب سوچ رہے تھے۔ یہ چائے بھی عجیب چیز ہے۔ پیٹ میں اترتے ہی اپنا کام شروع کر دیتی ہے نیند بھاگنا، تھکن دور کرنا اس کی خاصیت ہے۔ کھوج کرنے والوں نے کیا خوب کھوج کی ہے—— اور جس طرح گھر میں چائے کی موجودگی ضروری ہے اسی طرح بڑوں کا وجود بھی۔ اگر اماں بیچ میں نہ پڑتیں تو بے چارے بن جی سوتے رہ جاتے اور بچے کا امتحان خراب....

ایک انکر کے اوپر دو پلّو (ننھی پتیاں) اصل چائے یہی تو ہے ننھے سے وجود میں بڑا دم ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی ہر چیز سے الگ اس کی مہک۔ آج تک شاید ہی کسی نے کہا ہو کہ چائے کی مہک بری لگتی ہے۔

بن صاحب یہی سوچتے بائک دوڑائے جا رہے تھے۔ جب وہ لوگ وہاں پہنچے گیٹ بند کیا جا رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر گیٹ کیپر نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ منن اندر چلا گیا۔

شام کو واپسی کے بعد منن سیدھا دڈا کے پاس آ گیا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ اس کے پرچے بھی بہت اچھے ہوئے تھے۔ صبح صبح دڈا کی ڈانٹ سن کر پاپا کو سہمتے دیکھ کر اسے بڑا مزا آیا تھا۔ اس نے آج پاپا کا بچپن دیکھا تھا۔

''دڈا.... یہ چائے کس نے بنائی ہے۔''

''اسی نے۔ جس نے یہ اتنی بڑی دنیا بنائی۔ طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں۔''

رات کے کھانے کے بعد منن دڈا کی گود میں جا گھسے۔

''دڈا کہانی... ہم بھی... دڈا ہم بھی کہانی چھنیں گے۔ بے بی نے ان کا آنچل کھینچا...

دھیرے دھیرے سب ان کے پاس آ گئے۔ کل سے اسکول میں چار دنوں کی چھٹی ہو رہی تھی۔ اس لیے سب ذرا پرسکون تھے۔ منن کی ممی بولیں۔ اماں سے کہانی سننے کا آج میرا بھی دل کر رہا ہے۔''

دڈا نے گلا کھنکھارا... سب ان سے ذرا اور قریب ہو گئے۔

''کہتے ہیں کسی زمانے میں ملک چین بڑا غریب دیش ہوا کرتا تھا۔'' ''جی ہاں.....'' دادا جی کی آواز سن کر سب چونک گئے۔

''یہ اچانک کہاں سے ٹپک پڑے..... اب شروع ہوگا ان کا ملٹری ایکٹ۔'' دڈا بڑبڑائیں۔

''ارے نہیں بھاگوان آج تو آپ نے میرا قانون توڑ ہی دیا ہے۔ اس لیے ہم آپ کی محفل میں شامل ہونے چلے آئے—

یہ سورج کدھر سے نکل آیا منن میاں؟''

''سورج تو پورب سے ہی نکلا ہے دؤا۔ آپ کے پیچھے ہی تو سورج کھڑا ہے پلٹ کر دیکھیے تو سہی—''

دؤا کی پیٹھ پورب کی طرف ہی تھی اور دادا جی وہیں کھڑے تھے۔

سب ہنس پڑے۔ چاند نے بادلوں کے پردے سے جھانکا۔ روشنی کھل اٹھی۔

''ملک چین میں دو میاں بیوی رہتے تھے جو غریبی کے باعث زمیندار کے کھیت میں کام کرتے تھے۔

کچھ دن بعد ان کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ بچے کا نام انھوں نے 'چیانگ' رکھا۔ بچہ خوب صورت اور گول مٹول تھا۔ دونوں اپنے بچے کو بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن چھوٹے بچے کی وجہ سے ماں کو کچھ دن گھر پر ہی رہنا پڑا۔ باپ کی ذمے داری دوگنی ہوگئی۔

اسے اکیلے ہی سارا کام کرنا پڑتا۔ وہ بہت تھک جاتا تھا۔ کچھ دن اسی طرح بیتے لیکن ایک اکیلے کی کمائی میں گھر چلانا مشکل ہوتا تھا۔ اس لیے چیانگ کی عمر کے تین مہینے بعد ماں بھی کام پر جانے لگی۔ وہ چیانگ کو ایک کپڑے کے تھیلے کے اندر رکھ کر اپنی پیٹھ پر باندھ لیتی اور دونوں کام کرتے رہتے۔ لیکن جب بچہ ہاتھ پیر مارنے لگا تو انھوں نے اپنے کھیت میں ایک بڑے درخت کی ڈال پر جھولا بنایا اور بچے کو اس میں لٹا کر اپنا کام کرنے لگے۔

وقت کے ساتھ ساتھ بچہ بڑا ہوتا گیا اور شرارتیں کرنے لگا۔ ادھر ادھر بھاگ نہ جائے اس کے لیے اس کی کمر میں ایک ریشم کی ڈوری پہنا دی گئی اور اس میں رسی باندھ کر اسے پیڑ کے تنے سے باندھ کر رکھا جانے لگا۔ جہاں تک درخت کا سایہ پہنچتا تھا وہاں تک رسی کی لمبائی رکھی گئی تاکہ وہ چل پھر سکے لیکن اس کی ایک بری عادت ہوگئی تھی کہ وہ زمین سے اٹھا کر ہر چیز اپنے منھ میں ڈال لیتا تھا۔ ان لوگوں نے آس پاس کی ساری زمین کو صاف کیا اور گوبر لا کر لپائی بھی کی کہ بچے کو کوئی گندی چیز نہ ملے۔

اب بچہ پانچ سال کا ہو چلا تھا۔ اس لیے پاس کے ایک پرائمری اسکول میں اس کا داخلہ بھی ہوا۔ دھیرے دھیرے بچوں کے گروپ کے ساتھ اسکول جانے لگا۔ لیکن اس کی اوٹ پٹانگ چیزیں منھ میں ڈالنے کی عادت بنی رہی۔ اس کی نظر بہت تیز تھی۔ آتے جاتے کچھ نہ کچھ دکھائی دے جاتا اور وہ گروپ سے نکل کر وہاں پہنچ جاتا۔ درختوں کے کھوکھے میں جھانکتا سی کی چھال ادھیڑتا کہ اس کے نیچے کیا ہے۔ ایسے میں اکثر بچے اسکول میں دیر نہ ہو جائے سوچ کر اسے اکیلے چھوڑ جاتے وہ زمینوں کے نیچے درختوں کی شاخوں، چھالوں اور جڑوں کے نیچے نئی دنیائیں تلاش کرنے میں لگا رہتا۔

ایسے ہی ایک دن ٹہلتے ٹہلتے وہ جنگل کی طرف بڑھ گیا۔ بہت آگے جانے پر اسے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ اس کے سامنے صاف ستھری زمین تھی اور وہاں ایک رشی سادھو کھلے آسمان کے نیچے تپسیا میں مصروف تھے۔ وہ ذرا بھی ہل ڈل نہیں رہے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر بالکل ساکت تھیں۔ سورج کی روشنی میں چہرہ سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ بچے کو ان کا یہ رنگ روپ بہت اچھا لگا اور پھر وہ ہر روز وہاں جانے لگا۔ دور کھڑا انھیں دیکھتا رہتا۔ اسی طرح تقریباً اڑتیس دن بیت گئے۔

انتالیسویں دن جب وہ وہاں پہنچا تو سادھو مہاراج وہاں ان کے بیٹھنے کی جو جگہ تھی اس کے آس پاس زمین پر آنکھوں کی پلکیں گری تھیں۔

آناً فاناً میں خبر پھیل گئی۔ سادھو مہاراج چالیس دن کی تپسیا میں گاؤں والوں کی فریاد پر ہی بیٹھے تھے۔ پچھلے دو سالوں سے وہاں سوکھا پڑ رہا تھا اور بارش کے لیے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ بھوک اور بیماری سے لوگ مر رہے تھے۔ سادھو مہاراج ان ہی کے لیے تپسیا پر بیٹھے تھے۔ مگر بہت کوشش کے باوجود انچالیسویں رات کو ان کی آنکھ جھپک گئی۔ تپسیا بھنگ ہو جانے کے دکھ سے انھوں نے اپنی آنکھوں کی پلکیں نوچ کر پھینک ڈالیں اور دور جنگل میں گم ہو گئے۔ سارا گاؤں سوگ میں ڈوب گیا۔ سادھو مہاراج کے گم ہو جانے کا دکھ بہت گہرا تھا۔ اس رات کسی کے گھر چولہا نہیں جلا۔

آدھی رات کو اچانک ہی بجلی زور سے چمکی، بادل گرجے اور خوب بارش ہوئی۔ سادھو مہاراج کے لیے بادل بھی رو پڑے تھے۔ لیکن پیٹ کی آگ بہت بری ہوتی ہے۔ دو دن بعد سب اپنے اپنے کھیتوں کی جتائی میں لگ گئے۔ سادھو مہاراج کی تپسیا بھنگ ہونے کے باوجود پوری ہو گئی تھی۔

کئی دن کے بعد وہ بچہ بھی گھر سے نکلا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم اسی طرف بڑھتے چلے گئے۔ جہاں سادھو مہاراج کی کٹیا تھی۔

وہاں کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ جہاں جہاں سادھو کی آنکھوں کی پلکیں گری تھیں وہاں ان کے بیچ سے ننھے ننھے انکھوئے پھوٹ رہے تھے۔

چند ہی دنوں بعد ان کے اوپر دو پلو اُگ آئے۔ ہلکے ہرے نازک سے پلو عادت کے مطابق بچے نے پلو توڑ کر منھ میں ڈال لیے۔ اسے کچھ الگ سا محسوس ہوا۔ اچھا لگا اور تازگی کا احساس ہونے لگا۔ اس کے تھوڑے سے پتے اور توڑ لیے۔ اور لاکر ماں کو دیے۔ بتایا کہ جہاں سادھو مہاراج تپسیا پر بیٹھے تھے۔ یہ پتے وہیں اُگے ہیں۔ چونکہ سادھو مہاراج کی عظمت کے سب قائل ہو گئے تھے۔ اس لیے پرساد سمجھ کر سبھوں نے وہ پتے منھ میں ڈال لیے۔

بچو! یہی پتے آگے چل کر چایانگ کی کھوج کے باعث چائے کہلائے۔ ان کا چلن عام ہوا اور اب یہ چائے ہم سب کی زندگی میں شامل ہے۔ جو تازگی عطا کرتی ہے۔ نیند بھگاتی ہے اور انرجی دیتی ہے۔ مہمان نوازی کے کام آتی ہے۔ اگر کسی کے گھر میں کچھ نہ ہو تو مہمان کو چائے ہی پلا دی جاتی ہے۔ جس سے وہ تازہ دم ہو جاتا ہے۔ چائے کے باغوں سے بہت ساری کہانیوں نے جنم لیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے چائے کے باغ پر ایک ناول لکھ ڈالا جس نے ان باغوں کو نہیں دیکھا دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے۔ جس نے دیکھا وہ پھر دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک سادھو کی تپسیا بھنگ ہوئی۔ انھوں نے اپنی آنکھیں نوچ ڈالیں۔ ان آنکھوں کے خون سے انکھوے پھوٹ نکلے۔ ایک بچے نے اس کی کھوج کی اور اب یہ چائے ساری دنیا میں مشہور ہے اور ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئی ہے۔ ایک انکر اور دو پلّو۔

دداّ نے کہانی ختم کی ''انٹرسٹنگ'' پاپا بولے۔

''چائے زندہ باد...'' بچوں نے شور مچایا اور پھر سب سونے چلے گئے۔

■

Sheerin Niyazi
Teachers Colony,
Bhurkunda - 829135 (Jharkhand)

پرویز شہریار

خدانیت دیکھتا ہے

''**بچپن** میں جو شرارتی ہوتے ہیں،
وہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں، بڑے ہو کر، اکثر.....''

میں نے بھی بچپن میں بہت شیطانی کی ہے۔ ایک پل کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ہر وقت شرارتیں کرتا رہتا..... گھر میں ہوں تو چھوٹی بہنوں کے کھیل بگاڑ دینا۔ بڑے بھائیوں سے تیور سے بات کرنا۔ گھر سے باہر گیا تو کسی کے پتھر مار دیا، کسی کا غلیل چھین لیا، کسی کی پتنگ پھاڑ دی، کسی کی آنکھ پہ گلی مار دی۔ آئے دن گھر میں لوگوں کی شکایتیں آتی رہتی تھیں۔

والد صاحب کا حکم تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہونے سے پہلے گھر آجاؤ۔ میں کبھی مغرب سے پہلے گھر نہیں آتا تھا۔ جب جھٹ پٹے کا وقت ہوتا، اندھیرے اُجالے مل رہے ہوتے، اسی وقت چور پولس کھیلنے میں سب سے زیادہ مزہ آتا اور جب کھیل سب سے زیادہ مزیدار موڑ پر ہوتا، عین اسی وقت منجھلے بھائی آ کر سر پر سوار ہو جاتے۔

''جلدی چل! ابا دفتر سے گھر آ گئے ہیں۔ تجھے بلا رہے ہیں۔''

ایسے میں سارا مزہ کرکرا ہو جاتا اور جیتی ہوئی بازی ہار کر اداس چہرہ لیے ان کے ساتھ ہو لیتا۔ سارے دوست روکتے رہ جاتے اور میں منجھلے بھائی کے ہاتھوں گرفتار کسی قیدی کی طرح پیچھے پیچھے پسینے میں شرابور چہرہ لیے، دل مسوس کر گھر لوٹ آتا۔ گھر آتے ہی منہ ہاتھ دھو کر کتاب پڑھنے بیٹھ جاتا۔ تب چپکے سے اماں آواز دے کر بلا لیتیں اور وہ مٹی کے چولہے سے لگے فرش پر ہمہ وقت بچھی رہنے والی ٹاٹ پر بٹھا کر کچھ کھانے کو دے دیتیں۔ اس وقت اماں مجھے بہت اچھی لگتیں کیونکہ وہ مجھ نو گرفتار کے دل کی کیفیت خوب سمجھتی تھیں اور یوں مجھے ابا کی ڈانٹ سے راحت مل جایا کرتی تھی۔ منجھلے بھائی اور بہن کو پڑھائی کے دوران ٹھیک سے پڑھائی نہ کرنے کے سبب خوب ڈانٹ پڑ رہی ہوتی تھی۔

ابا صبح آٹھ بجے دفتر کے لیے نکل جاتے تھے۔ ان کے جاتے ہی میں بھی انگڑائی لیتا ہوا، ناشتے سے اٹھتا اور گلی ڈنڈا کھیلنے یا چرکھی لیے پتنگ اُڑانے کے لیے گھر سے باہر نکل جاتا۔ یہ میری روز کا معمول تھا۔

بغیر بتائے گھر سے غائب رہنے کی میری پرانی عادت تھی۔

ایک دفعہ بارہ ربیع الاوّل کی شب تھی۔ ساکچی بازار میں حفیظ ہوٹل کے سامنے عید میلاد النبی کا جلسہ تھا۔ سیرت النبی پر تقریر کے بعد رات ساڑھے دس بجے نعتیہ مشاعرہ شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے شعرا حضرات اپنے کلام پیش کرتے رہے۔ تقریب اتنی دلچسپ تھی کہ وقت کے گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا۔ ہم اچھے اچھے اشعار اپنے ساتھ لے گئے کاغذ کے ٹکڑوں پر نوٹ کرتے رہے۔ بہرصورت، مشاعرہ اپنے وقت پر ختم ہوا تو اُس وقت صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

دوستوں نے پروگرام بنایا کہ اب فجر کی نماز پڑھ کے ہی گھر جایا جائے۔ ایمان کا جذبہ جوش مار رہا تھا۔ سبھوں نے بیک زبان حامی بھر لی۔

ہمارے دوستوں کے اس گروپ میں میری عمر سب سے کم یعنی بارہ سال کی تھی۔ جب کہ دوسرے دوست چودہ، پندرہ سال کے بھی تھے۔ خالد مجھ سے ایک سال بڑا تھا۔ امجد چودہ سال کا تھا اور شمس پندرہ سال کا رہا ہوگا۔

شمس ہمارے گروپ کا لیڈر تھا۔ عمر میں بھی وہ ہم سب سے بڑا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ سمجھداری کی باتیں کیا کرتا تھا اور ہم سب اس کی ہر بات بے چوں و چرا مان بھی لیتے تھے۔ شمس چونکہ عملیات بھی کیا کرتا تھا۔ اس لیے ہم سب کو شمس کی، اتنی رات گئی، ایمان افروز تجویز کو مان لینے میں کوئی ہچکچاہٹ بھی محسوس نہیں ہوئی۔

جلسہ ختم ہوا تو کچھ ہی دیر میں بتیاں بھی گل کی جانے لگیں۔ لوگ اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ ہم وہیں پیٹھ کے کلھڑ میں آخری چائے پینے لگے۔ چائے پینے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنی آنکھوں سے نیند کو دور بھگایا جائے۔

چائے ختم کرتے ہی ہمارے قدم ساکچی جامع مسجد کی طرف بڑھنے لگے۔ جلسے والی جگہ سے جامع مسجد تقریباً ایک ڈیڑھ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھی۔

جب ہم مسجد پہنچے تو دیکھا کہ مسجد کا صدر دروازہ بند تھا۔ اُس پر تالا لگا ہوا تھا۔ ہم بغل کی دیوار پھاند کے اندر پہنچے۔ کالی سیاہ رات میں آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہم سب سیمنٹ کی میز پر وضو والے لمبے چوڑے حوض کے قریب ایک چبوترے کے نیچے سمٹ کر بیٹھ گئے۔

مسجد میں ہریالی بہت تھی۔ ناریل اور کھجور کے پیڑ سے ہوکر ہوا گزرتی تو سرسراہٹ کی آواز ہوتی تھی۔ یاسمین اور رات کی رانی کی خوشبوؤں سے سارا ماحول معطر ہو رہا تھا۔ تبھی کسی نے ''تی تی، تی تی....'' کی آواز سنی۔

خالد نے کہا۔ ''یہ جھینگر کی آواز ہے۔''

امجد نے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے جواز پیش کیا کہ یہ سانپ کی آواز ہے۔ ''پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھ کر سانپ مدہوش ہو اٹھتے ہیں اور مستی کے عالم میں ایسی آوازیں نکالتے ہیں۔''

اتنا سننا تھا کہ خالد ڈر کے مارے مجھ سے چپکنے لگا۔ میں نے محسوس کیا وہ ڈر سے کانپ رہا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اُسے ڈر تھا کہ سانپ اسے آکر ڈس نہ لیں۔

شمس نے اُس وقت بڑی عقلمندی دِکھائی اور اُس نے اُٹھ کر کچھ آیتوں کی با آواز بلند تلاوت کی اور پاس پڑی ہوئی سوکھی ٹہنی لے کر زمین پر ایک دائرہ کھینچ دیا۔ پھر اس نے کہا:

''اب اس دائرے کے اندر بھوت پریت سانپ بچھو کوئی بھی اندر نہیں آسکتا ہے۔ میں نے اس جگہ کو دم کر دیا ہے۔'' تب جا کر ہم سبھوں کو قدرے اطمینان ہوا۔ کیونکہ ہم سبھی جانتے تھے کہ شمس کچھ عمل بھی کرتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ہم صبح سیر کو میدان میں نکلتے تو شمس سورج کی طرف رُخ کر کے اس کے طلوع ہونے کا انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ جب سورج کی کرنیں زمین پر روشنی بکھیرنا شروع کر دیتیں، عین اس وقت شمس اپنی نظریں سورج کے مرکز پر پیوست کر دیتا اور گھنٹوں سورج سے آنکھیں چار کرتا رہتا تھا۔

ہمارے دریافت کرنے پر اس نے ہمیں بتایا تھا کہ اس طرح کے مسلسل عمل سے سورج کی گرمی اس کی آنکھوں میں آجائے گی اور اس کے بعد وہ جسے آنکھ بھر کے دیکھ لے گا وہ شخص وہیں بھسم ہو جائے گا۔ یہ انتہائی دِقت طلب عمل تھا۔ لیکن شمس اسے مہینوں کرتا رہا تھا۔

ہم سب بیٹھے فجر کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ ابھی اُفق پر صبح صادق کی سفیدی پھیلنے میں دیر تھی۔ تب تک جنات کی بات نکل گئی۔

شمس نے کہا۔ ''مسجد میں رات بھر جنات عبادت کیا کرتے ہیں۔ اس لیے صبح صادق سے پہلے ہمیں مسجد کے اندر داخل نہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''ہمارے گھر کی چھت پر جنات آتے ہیں۔ کیونکہ جب ہماری امی زنانہ میلاد کی محفل سجاتی ہیں تو گھر میں شکر پارے بنائے جاتے ہیں۔ میلاد کے بعد سبھی مہمانوں کو تبرک کے طور پر شکر پارے دیے جاتے ہیں۔ پھر ہماری امّی گھر کی چھت پر بھی شکر پارے رکھوا دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جن بھی میلاد خوانی کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور در پردہ شریک ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں بھی تبرکات تقسیم کی جانی چاہئے۔ شام میں شکر پارے چھت پر رکھ دیے جاتے ہیں اور صبح جب کبھی میں پتنگ اڑانے چھت پر چڑھتا ہوں تو وہاں سے شکر پارے نہ جانے کیسے غائب ہو جاتے ہیں۔ شکر پاروں کا ذرہ برابر بھی نشان نہیں ہوتا۔''

امجد نے ایک قصہ سنایا۔ ''جنات اچھے اور برے دونوں قسم کے ہوتے ہیں.....

ایک دفعہ میدان میں بھونڈر اُڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک خدا رسیدہ بزرگ نے بھونڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو!، مبارک ہو!''

اتنا کہنا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی تھال میں وہاں بیابان میں ایک دم سے گرما گرم جلیبیاں آ گئیں، سبھوں نے خوب سیر ہو کر جلیبیاں کھائیں۔

اسی طرح کا بھونڈر ایک دوسرے مقام پر اڑ رہا تھا۔ اس خدا رسیدہ بزرگ کے حوالی موالی میں سے ایک شخص نے مٹھائیاں پانے کے لالچ میں آ کر کہہ دیا۔

''مبارک ہو!، مبارک ہو!''

اتنا کہنا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اسے وہ پٹخنیاں پڑنے لگیں..... وہ پٹخنیاں پڑنے لگیں..... کہ اس کی حالت ابتر ہو گئی اور وہ گھنٹوں بدحواس پڑا رہا۔

واقعہ یہ تھا کہ پہلی بار جنوں کی بارات جا رہی تھی۔ جنوں نے مبارک باد کے عوض انھیں جلیبیاں پیش کر دیں لیکن دوسری دفعہ جنوں کا جنازہ جا رہا تھا۔ ایسے غم کے موقع پر مبارک باد پیش کرنا حماقت تھی۔ چنانچہ، مٹھائیاں تو کجا، الٹے پٹخنیاں پڑنے لگیں۔''

اسی لیے کہا گیا ہے کہ نیم حکیم خطرۂ جان یعنی ادھوری معلومات بعض اوقات وبالِ جان بن جاتی ہے۔

ہم مسجد میں بیٹھے فجر کے وقت کا بے صبری سے انتظار کر ہی رہے تھے کہ میرے گھر میں میری گم شدگی کی خبر سے کہرام مچ گیا۔ چاروں طرف ہمارے بھائیوں اور ان کے دوستوں کو

میری تلاش میں دوڑایا گیا۔ میری شہرت شیطان کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ گلی محلے کے لڑکوں میں اپنی شرارتوں کی وجہ سے ویسے ہی مشہور تھا۔ میرے کسی دوست یا واقف کار نے بتا دیا کہ ان چنڈال چوکڑیوں کو شہر کی جامع مسجد کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

ہمارے دونوں ننھے اور بڑے بھائیوں نے جب اندھیرے میں ہونے والی ہماری باتیں سنیں تو مجھے آدھر دبوچا اور میں پھر دل مسوس کر، چار و ناچار، کسی نو گرفتار قیدی کی طرح، ان کے پیچھے پیچھے گھر لوٹ آیا۔ میرے سارے دوست روکتے رہ گئے کہ فجر کی نماز پڑھ کر جانا پرویز۔ لیکن تب تک سارا مزہ کرکرا ہو چکا تھا اور میں جیتی ہوئی بازی ہار کر بادل نہ خواستہ اُن کے ہمراہ گھر کی طرف چل پڑا۔

میرا دل اب بھی فجر کی اُس باجماعت نماز کی لذت کی طرف مائل تھا، جہاں پر میں اپنے دوستوں کے ساتھ صفِ اوّل میں خُدا کے حضور دست بستہ کھڑا ہوتا..... لیکن، یہ ممکن نہ ہوسکا اور میں دستِ تاسف ملتا رہ گیا۔

گھر لوٹتے وقت، اچانک ایک خیال آیا اور اِس خیال کے آتے ہی میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔

میرے والد صاحب اکثر کہا کرتے تھے۔ ''عمل کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔''

واقعی، یہ سچ ہے کہ خدا نیت دیکھتا ہے!

■

Dr. Perwaiz Shaharyar
Flat No. 4/48, NCERT Campus
Sri Aurbindo Marg, New Delhi - 110016

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر..... بتاریخ.....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .....

پتہ : .....

.....

.....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159 E-mail:sales@ncpul.in,

دستخط

فاطمہ شاہین

ایک کہانی

آؤ سنائیں تمھیں کہانی، چڈھا راجہ چڑیا رانی
دونوں اِدھر اُدھر اڑتے تھے دانہ چگتے خوش رہتے تھے

اک دن دونوں نے یہ سوچا، کیوں نہ اپنا بھی گھر ہوتا
تھک کر ہم بھی سو جائیں گے، شکرِ خدا بجا لائیں گے

دونوں دن بھر تنکے لاتے، محنت سے پھر اسے سجاتے
پیڑ کے اوپر بنا کے اک گھر، خوش ہوئے دیکھ کے سارا منظر

اک دن دانہ چگتے چگتے، دیکھا اک ننھا سا بچہ
دونوں نے پھر خدا سے مانگا، پیارا سا اک منا بچہ

خدا تو سب کی سن لیتا ہے ان کے گھر بھی بچے آئے
ننھے ننھے پیارے پیارے ماں کی آنکھوں کے وہ تارے

چڑیا رانی نے جو دیکھا آنکھیں ابھی ہیں ان کی بند
بھول کے اپنا کھانا پینا دوڑ کے لائی وہ اک دانہ

چونچ میں اپنی دانہ بھر کر روز کھلاتے دونوں جم کر
پر نکلے جب ان دونوں کے چڑیا چڈھے خوش ہو چہکے

دھیرے دھیرے طاقت آئی، دونوں نے اڑنا سکھلایا
کیسے چلنا کیسے اڑنا کیسے رہنا کیسے چگنا

صبح سویرے سب اڑ جاتے، شام کو لیکن گھر آجاتے
پیار سے بیٹھ کے کھانا کھاتے کھانا کھا کر سب سو جاتے

ایک شام کو چڑیا رانی بچو کا رستہ تکتی تھی
چڈھا بھی ان کو ڈھونڈ رہا تھا، آنسو اپنے پونچھ رہا تھا

پر وہ لوٹ کے گھر نہ آئے دونوں غم سے ہوئے نڈھال
موہ میں ان کے روتے روتے سمجھ میں آیا پھر اک راز

دنیا تو فانی ہے بچو باقی رہے گی خدا کی ذات
کیسی لگی تمھیں یہ کہانی سچ سچ کہنا دل کی بات

■

Fatima Shaheen
D-813, GTB Nagar
Karely, Allahabad 211016 (UP)

آدابِ گفتگو

مظہر الاسلام

آداب گفتگو میں اتنا رہے خیال
دل نہ دکھے کسی کا، کسی کو نہ ہو ملال
کچھ بولنے سے پہلے الفاظ تول لیے
بے وقت بے وجہ کچھ ہرگز نہ بولیے
چھوٹوں سے گفتگو میں رہے نرم شیریں لہجہ
تعریف ہو تمہاری، ہو وہ بات میں سلیقہ
کوئی محوِ گفتگو ہو، ہرگز نہ بات کاٹو
نہ بحث ہی بے سبب ہو نہ تکرار بے وجہ ہو
نہ ہو تلخ اتنا لہجہ کہ دلوں کو چیر جائے
لگے ناگوار سب کو، خود کو بھی شرم آئے
ہو وہ بات میں سلیقہ تعریف ہو تمہاری
کرو بات جب کسی سے لگے بات سب کو پیاری
نہ آواز اتنی اونچی لگے ناگوار سب کو
تنقید اور غیبت، نہ کسی کی پشت پر ہو
کانوں میں رس جو گھولے کرو بات میٹھی میٹھی
ہو زبان اتنی شیریں، جیسے گھول دی ہو مصری

■

Mazharul Islam
31, Behliman, Upper Kote
Buland Shahar - 203001 (UP)

نہ پانی کو تم کرنا برباد بچو

محمد وکیل

اٹھو تم سویرے، پیؤ خوب پانی
تو بہتر رہے گی سدا زندگانی
کبھی کھا کے پینا نہ فوراً تو پانی
یہ کہتی تھی ہر دم مری نیک نانی
سمجھ لو کہ پانی سے ہے زندگانی
کئی نعمتوں سے ہے بڑھ کر یہ پانی
کئی لوگ برباد کرتے ہیں پانی
زمیں کی تہوں میں ہے محدود پانی
جتانا نہ اس پر بھی حق خاندانی
کبھی بھی نہ پانی کی ہو مولا قلت
نہ ہو اس سے غافل کبھی اپنی ملت
مقدس ہے بچو! یہ زمزم کا پانی
کہ قرآن کہتا ہے اس کی کہانی
دواؤں کی ہے بس دوا آبِ زمزم
مسلمان رکھتے ہیں گھر میں یہ ہر دم
جو برباد کرتا ہے پانی کو بچو!
ترستا ہے وہ زندگانی کو بچو!
یقیناً جو پانی زیادہ پیے گا
مرض کے بنا وہ زیادہ جیے گا
کرو خود عمل اور سب کو بتاؤ
بے مقصد علیمی نہ پانی بہاؤ

■

Md. Wakeel
B.L 4, H/No: 5, P.O: Kankinara - 24
Parganas (North) - 743126, Kolkata (WB)

جاوید نہال حشمی

بجلی کا جھٹکا دینے والی مچھلیاں

ذرا سوچیں راہ چلتے اچانک کچھ لوگ آپ پر حملہ کرنے کے لیے آپ کو گھیر لیتے ہیں۔ پھر اپنے ہاتھوں میں خطرناک ہتھیار لیے غصے میں آگے بڑھتے ہیں۔ مگر 40 فٹ قطر کے دائرے میں داخل ہوتے ہی اچانک دردناک چیخ کے ساتھ زمین پر گر کر تڑپنے لگتے ہیں۔ جلد ہی کچھ مرجاتے ہیں اور کچھ دم توڑ دیتے ہیں۔ حیرت زدہ راہ گیر ان کی مدد کو آگے بڑھتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے کسی اَن دیکھی طاقت کے اثر سے وہ اچھل کر دور جا پڑتے ہیں۔ اب وہ ڈر سے آپ کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پھر آپ کو آگے بڑھتے دیکھ کر وہ اس طرح پیچھے ہٹتے ہیں جیسے آپ جسم سے نکلنے والی طاقت ور بجلی کی لہروں کے اثر سے اپنے کو دور رکھنے کی کوشش کر رہے ہوں...

یقیناً آپ کو کسی مشہور سائنس فکشن یا ہالی ووڈ کی ایڈونچر فلموں کی یاد آ جائے گی کیونکہ ایسا انسان صرف فلموں یا افسانوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ لیکن اصلی دنیا میں انسان نہ سہی، حقیقی مچھلیاں موجود ہیں۔

جی ہاں، یہ نہ صرف حقیقی مچھلیاں ہیں بلکہ اب بھی دنیا میں تقریباً ہر جگہ گرم اور معتدل پانیوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ مخصوص شکل والی مچھلیاں ہیں جنہیں مجموعی اعتبار سے 'ریز' (Rays) کہتے ہیں۔ ریے مچھلیاں پیٹھ اور پیٹ کی جانب سے چپٹی ہوتی ہیں اور ڈھانچہ کرکری ہڈیوں (Cartilage) کا ہوتا ہے۔ سر کے گرد اگلے پروں (Pectoral Fin) کے پھیلاؤ کے سبب ان کا جسم چپٹا، تھل تھل اور تقریباً دائرہ نما یعنی گول ہوتا ہے۔ مضبوط دُم پر پیٹھ سے ہوتے ہوئے دو بڑے ڈنک (فِن) اور ایک ترقی یافتہ ڈنک (Caudal fin) ہوتے ہیں۔ ان کے نتھنے، منہ اور گلپھڑوں کے سوراخ نیچے کی جانب ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے دم پر زہریلا کانٹا ہوتا ہے جو ان کی حفاظت کرتا ہے۔ انھیں 'ڈنک ریز' (Sting rays) کہتے ہیں۔ جن ریز کی دم پر یہ زہریلے کانٹے نہیں ہوتے انہیں اسکیٹس (Skates) کہا جاتا ہے۔ جب کہ وہ مخصوص ریز جن کی دم پر زہریلے کانٹوں کی بجائے سر پر بجلی کا جھٹکا (Electric shock) دینے والے مخصوص اعضا ہوتے ہیں، برقی ریز

(Electric Rays) کہلاتی ہیں (تصویر ا دیکھیں)۔

بجلی کا جھٹکا دینے والی ان مچھلیوں کو تارپیڈو (Torpedo) بھی کہا جاتا ہے۔ سمندر کے نیچے آب دوز جہازوں سے داغے جانے والے بم کے گولوں کو بھی تارپیڈو کا نام دراصل ان ہی مچھلیوں کی خصوصیات کی بنا پر دیا گیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ساحل کے قریب کم گہرے پانی میں پائی جاتی ہیں۔ البتہ ان کی کچھ قسمیں ایک ہزار میٹر (تین ہزار تین سو فٹ) یا اس سے بھی زیادہ گہرائی میں رہتی ہیں۔

تصویر ا

تارپیڈو یا برقی ریز کے علاوہ دو اور قسم کی مچھلیوں میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ایک بام مچھلی (Eel) اور دوسری برقی گربہ ماہی (Electric Catfish) (تصویر دیکھیں)۔ ان تینوں میں، بام مچھلی سب سے طاقتور بجلی کا جھٹکا دیتی ہے جب کہ برقی گربہ ماہی نام کی مچھلی سب سے کمزور ہوتی ہے۔ یوں تو تمام جانوروں اور انسانوں کے اندر جسمانی حرکت کی شکل میں بجلی کی لہر دوڑتی ہے، لیکن یہ مچھلیاں اپنے مخصوص برقی اعضا میں بیٹری کی مانند نہ صرف بجلی جمع رکھتی ہیں بلکہ بہ وقت ضرورت ایک زوردار جھٹکا دیتی ہیں کہ انسان مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔

بجلی یا لہریں ایک مخصوص قسم کے خلیوں میں پیدا ہوتی ہیں جنھیں برقی خلیے (Electrocytes) کہتے ہیں۔ یہ برقی خلیے دراصل گوشت یعنی عضلاتی خلیوں کی ہی مخصوص تبدیل شدہ شکلیں ہیں جو ٹکیوں (Disk) کی مانند چپٹی ہوتی ہیں اور ایک کے اوپر ایک ستون کی شکل میں سجی رہتی ہیں۔ ایک مچھلی کے جسم میں ہزاروں برقی خلیے بے شمار ستونوں کی شکل میں اکٹھا موجود ہوتی ہیں جنھیں Electroplates کہتے ہیں۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں الیکٹروپلیٹس کے باہم ملنے سے برقی عضو (Electric organ) کی تشکیل ہوتی ہے۔ تارپیڈو یا برقی ریز میں یہ برقی اعضا ایک جوڑے گردوں کی شکل میں بدن کے اوپری حصے سر پر پھیپھڑوں اور pectoral فِن کے درمیان موجود ہوتے ہیں (تصویر دیکھیں) جب کہ بام مچھلی (Electric eel) میں برقی عضو جسم کے دونوں طرف پوری لمبائی میں سر سے دم تک اندر پھیلا ہوتا ہے (تصویر دیکھیں) اور برقی گربہ ماہی نام کی مچھلی (Electeric catfish) میں یہ برقی اعضا جیلی کی طرح ہوتے ہیں۔ پورے جسم کو خول کی شکل میں ڈھکے رہتے ہیں (تصویر ۲ دیکھیں)۔

ہر خلیہ 150 ملی وولٹ (0.15v) طاقت کی بجلی پیدا

تصویر ۲

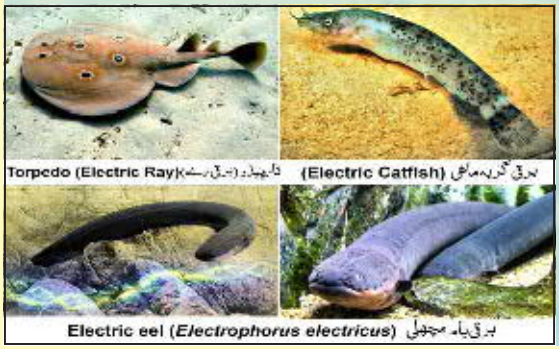

کرتا ہے جس سے لگنے والا جھٹکا نہایت کمزور ہوتا ہے۔لیکن تمام برقی خلیوں کی مجموعی طاقت زبردست ہوتی ہے۔ایک قیاس کے مطابق، بیٹری کی ایجاد ان ہی برقی خلیوں کے اجتماعی اثر کے مشاہدے کے نتیجے میں عمل میں آئی ہے۔ ہمارے گھروں کے بجلی کے تاروں میں دوڑتے برقی رَو کا انحصار الیکٹرون کے بہاؤ پر ہوتا ہے جب کہ جاندار جسموں میں بجلی لہر سوڈیم اور پوٹاشیم آیون کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے جنھیں خلیے دماغ سے تحریک پاکر اپنے اندر سے باہر پمپ کر دیتے ہیں۔ برقی خلیے عصبوں کے ذریعے مچھلی کے دماغ سے رابطے میں رہتے ہیں۔مچھلی کے دماغ سے نکلنے والے ریشے (Cranial nerves) دونوں طرف شاخ در شاخ پھیلے ہوتے ہیں۔ ہر شاخ کا آخری سرا ایک برقی پلیٹ کے نچلے حصے سے جڑا رہتا ہے (تصویر ۳ دیکھیں)۔

مطالعے سے ایک دلچسپ اور حیرت انگیز بات سامنے آئی ہے کہ ہر خلیہ متوازی (ایک دوسرے کے برابر) سرکٹ کی طرح سست رفتاری سے چارج ہوتا ہے اور جھٹکا دیتے وقت تمام خلیے اچانک اور بیک وقت سیریز سرکٹ کی طرح اپنا چارج ایک ساتھ خارج کرتے ہیں جس سے زبردست وولٹ کا جھٹکا لگتا ہے۔بام مچھلی جیسے ہی اپنے شکار کو

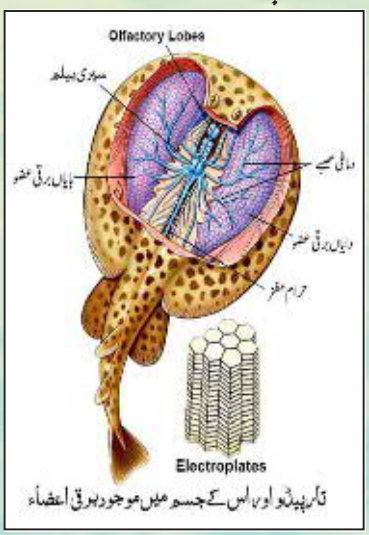

تصویر ۳

دیکھتی ہے اس کا Pacemaker نیورون حرکت میں آجاتا ہے اور Acetyl-choline نامی عصبی رطوبت ایک مخصوص حرکی عصبے کی مدد سے برقی خلیوں میں پہنچا دیتا ہے جسے وصول کرتے ہی تمام خلیے بیک وقت بجلی کا جھٹکا دیتے ہیں۔

برقی ریز جسامت میں ایک فٹ سے چھ فٹ (Torpedo Atlantic) تک ہوتی ہیں جس کا وزن 90 کیلو سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے۔اس کی مختلف نسلیں 37 وولٹ (Narcine) سے 220 وولٹ (اٹلانٹک تارپیڈو) تک کے جھٹکے دے سکتی ہیں جو ایک بالغ انسان کو بے ہوش یا مفلوج کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ ساحل کے قریب کم گہرے پانیوں میں سست رفتاری سے تیرتی دکھائی پڑتی ہیں۔یہ اسکیٹس کی طرح اپنے Pectoral fins کا استعمال نہ کر کے اپنے Caudal fins کی مدد سے آگے بڑھتی ہیں۔ یہ دن کے وقت عموماً تہہ میں ریت کے نیچے خود کو چھپا کر رکھتی ہیں اور ان کی ابھری ہوئی آنکھیں ریت سے باہر شکار کی گھات میں جھانکتی رہتی ہیں۔ شکار کے قریب آتے ہی یہ بجلی کے جھٹکے کے ذریعے اسے وقتی طور پر مفلوج کر دیتی ہیں اور پھر اپنے Pectoral فن کی مدد سے اسے اپنے منہ تک لے جاتی ہیں۔ یہ انسانوں کے لیے نہ صرف بے فائدہ مچھلیاں ہیں بلکہ ان کے لیے نقصان دہ بھی ہیں جب تک کہ اسے چھوا نہ جائے یا بے توجہی میں ان پر پاؤں نہ پڑ جائے۔ان میں سے کئی کی رنگت ریت جیسی ہوتی ہے تاکہ اپنے شکار کی نظروں سے اوجھل رہ کر حملہ کرسکیں۔ بام مچھلی کے جسم کی رنگت سبزی مائل بھوری ہوتی ہے جس کے سبب یہ تہہ میں موجود کیچڑ جیسی مشابہ ہونے کے نتیجے میں اپنے شکاری کی نگاہوں سے محفوظ رہتی ہے۔

برقی بام مچھلی (Electric eel) کے جسم میں پائے

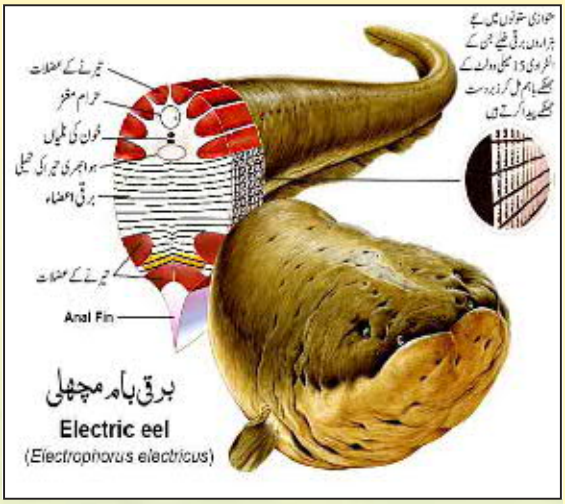

جانے والے برقی خلیے اس کے جسم کے مجموعی خلیوں کے آدھے ہوتے ہیں۔ جنوبی امریکہ کی ندیوں میں پائی جانے والی بام مچھلی (Electricus Electrophorus) درحقیقت 450 سے 650 وولٹ تک کے بجلی کے جھٹکے دے سکتی ہے جس سے بآسانی ایک نیون بلب روشن کیا جا سکتا ہے! اتنا زبردست بجلی کا جھٹکا پانی میں داخل ہونے والے کسی جاندار کے قدم بھی اکھاڑ دینے کے لیے کافی ہے۔ اگر ایسی دو تین مچھلیاں اس کے پیروں کو چھو جائیں تو تین گنا بائی وولٹ ایک پل میں اس کی حرکتِ قلب بند کر دیں گی!

مشاہدے و تحقیق کے مطابق، یہ مچھلیاں اپنے برقی اعضا سے نہ صرف اپنے شکار کو مفلوج یا ختم کر دیتی ہیں بلکہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے شکاری جانوروں (Predators) کو ڈرا کر دور رکھنے کے لیے بھی ان کا استعمال کرتی ہیں۔ حالیہ تجربوں سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ برقی بام مچھلی جب چلتی پھرتی ہے تو اس کے جسم سے کم طاقت کی بجلی کی لہریں نکلتی ہیں جو اس کے چاروں طرف بجلی پھیلا دیتی ہیں جس میں داخل ہونے والی ہر شے یا جاندار کے جسم سے ٹکرا کر لوٹنے والی لہروں کی مدد سے ریڈار کی مانند ان کی موجودگی کا احساس کرتی ہے۔ لہٰذا یہ اعضاء نہ صرف سمت جاننے میں مددگار ہوتے ہیں بلکہ آنکھیں کمزور ہونے کی وجہ سے زیادہ حساس عضو کے بطور بھی کام کرتے ہیں۔

سائنس دانوں کا قیاس ہے کہ یہ مچھلیاں اپنی برقی لہروں کی مدد سے ایک دوسرے کے درمیان پیغام پہنچانے کا کام بھی کرتی ہیں۔

برقی بام مچھلی کو ہاتھوں سے پکڑنے سے پہلے بجلی کے جھٹکے سے حفاظت کے لئے مخصوص دستانے پہننے پڑتے ہیں

ایک مطالعے کے مطابق، قدیم یونانی لوگ برقی ریز کا استعمال پیدائش اور آپریشن کے دوران متعلقہ اعضا سن کر کے درد کم کرنے کے لیے کرتے تھے۔ ایک رومن ماہرِ طب کے مطابق پہلی صدی عیسوی کے وسط میں لوگ تارپیدو کا استعمال سر درد اور جوڑوں کے درد کے علاج کے لیے بھی کرتے تھے۔

■

Javed Nihal Hashmi
B-5, Govt. R.I.I.E., Hastings
3, St. Georges Gate Road
Kolkata-700022

ایم رحمن

کہانی

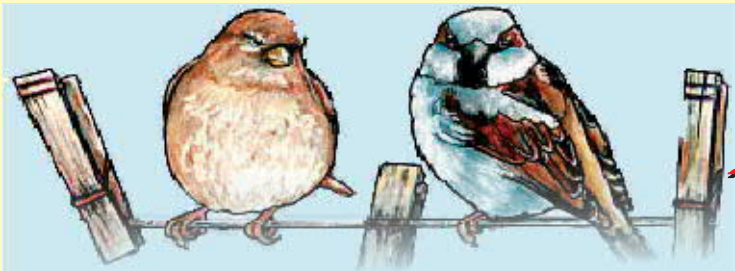

چوں چوں کی آواز

صبح کو وہ سو کر اٹھا تو کمرہ میں چڑیا کا انڈا ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ یہ گوریا کا انڈا تھا جس نے چھت کی لکڑی میں ایک گوشہ پا کر وہاں اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس گھونسلے کی وجہ سے کمرہ میں ہر وقت چڑیوں کا شور رہتا۔ گھر کے فرش پر تنکے گرتے رہتے۔

آدمی نے فرش پر ٹوٹا ہوا انڈا دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا اور بغیر سوچے سمجھے اس نے گھونسلہ اجاڑ کر پھینک دیا۔

اگلے دن پھر وہی 'چوں چوں' کا شور تھا مگر چڑیاں دوبارہ چھت کی لکڑی میں تنکے جمع کر رہی تھیں۔ شاید اجڑے ہوئے گھونسلے کو دوبارہ بنا بنایا دیکھنے کے جذبے نے ان کے اندر اپنے مشن کو کامیاب بنانے کا شوق بڑھا دیا تھا۔

دوسرا گھونسلہ انھوں نے اس سے کم مدت میں بنا لیا جتنی مدت میں انھوں نے پہلا گھونسلہ بنایا تھا چڑیوں کی اس ہمت پر اس کو غصہ آیا اور اس نے دوبارہ ان کا گھونسلہ اجاڑ کر پھینک دیا جو کہ ایک افسوس ناک عمل تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے چڑیوں پر آخری فتح پا لی ہے مگر چڑیوں کی بھی اپنی لگن تھی۔ ارادے مضبوط تھے یہی وجہ تھی کہ اگلے دن پھر گھونسلے کا مسئلہ اس کے سر پر تھا۔ چڑیوں نے جب دیکھا کہ ان کا بنا بنایا گھونسلا اجاڑ دیا گیا ہے اور انڈے توڑے جا چکے ہیں تو انھوں نے رونے میں یا فریاد کرنے میں وقت برباد نہیں کیا۔ انھوں نے ایسا بھی نہیں کیا کہ باہر جا کر دوسری چڑیوں کو ڈھونڈا اور ان کے ساتھ مل کر اس کے گھر پر حملہ کیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئیں اور ایک ایک تنکا لا کر دوبارہ گھونسلا بنانا شروع کر دیا۔

اب یہی روزانہ کا قصہ ہو گیا۔ چڑیاں روزانہ گھونسلہ بنانا شروع کرتیں اور آدمی روزانہ اس کو اجاڑ دیتا۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران کتنی ہی بار چڑیوں کی محنت ضائع ہوئی۔ ان کے چنے ہوئے تنکے بیکار ہو گئے۔ مگر چڑیاں ان چیزوں سے بے پروا ہو کر اپنا کام کیے جا رہی تھیں۔ آدمی کی نفرت کا جواب چڑیوں کے پاس صرف اور صرف خاموش عمل تھا۔ آدمی اب ہمت جٹانے سے دور ہوتا چلا گیا۔ ایک مہینہ کے ناکام مقابلے کے بعد وہ آدمی تھک چکا تھا۔ اب اس نے چڑیوں کا گھونسلہ اجاڑنا چھوڑ دیا۔ اب گوریا نے اپنے گھونسلے کو مکمل کر کے پھر اس میں انڈے دے دیے ہیں۔ وہ ان کو سینے میں مشغول ہے تاکہ وہ اپنی اگلی نسل پیدا کر سکے اور پھر اپنا کام کر کے اڑ جائے۔ جب یہ چڑیاں اپنے گھونسلے میں جمع ہوتی ہیں تو ان کا 'چوں چوں' کا شور اب بھی کمرے میں گونجتا ہے۔

مگر بچو! اب آدمی کو یہ شور برا نہیں لگتا کیونکہ 'چوں چوں' کی آواز میں اس کو یہ قیمتی پیغام سنائی دیتا ہے۔ اپنے دشمن سے نفرت نہ کرو۔ ہر حال میں اپنی جد وجہد میں لگے رہو۔ کامیابی ضرور ملے گی!"

■

M. Rahman
160, Ghalib Apts, Pitampura
Delhi - 110034

بچوں کی دنیا

دوسری قسط

باتصویر کہانی

زمین

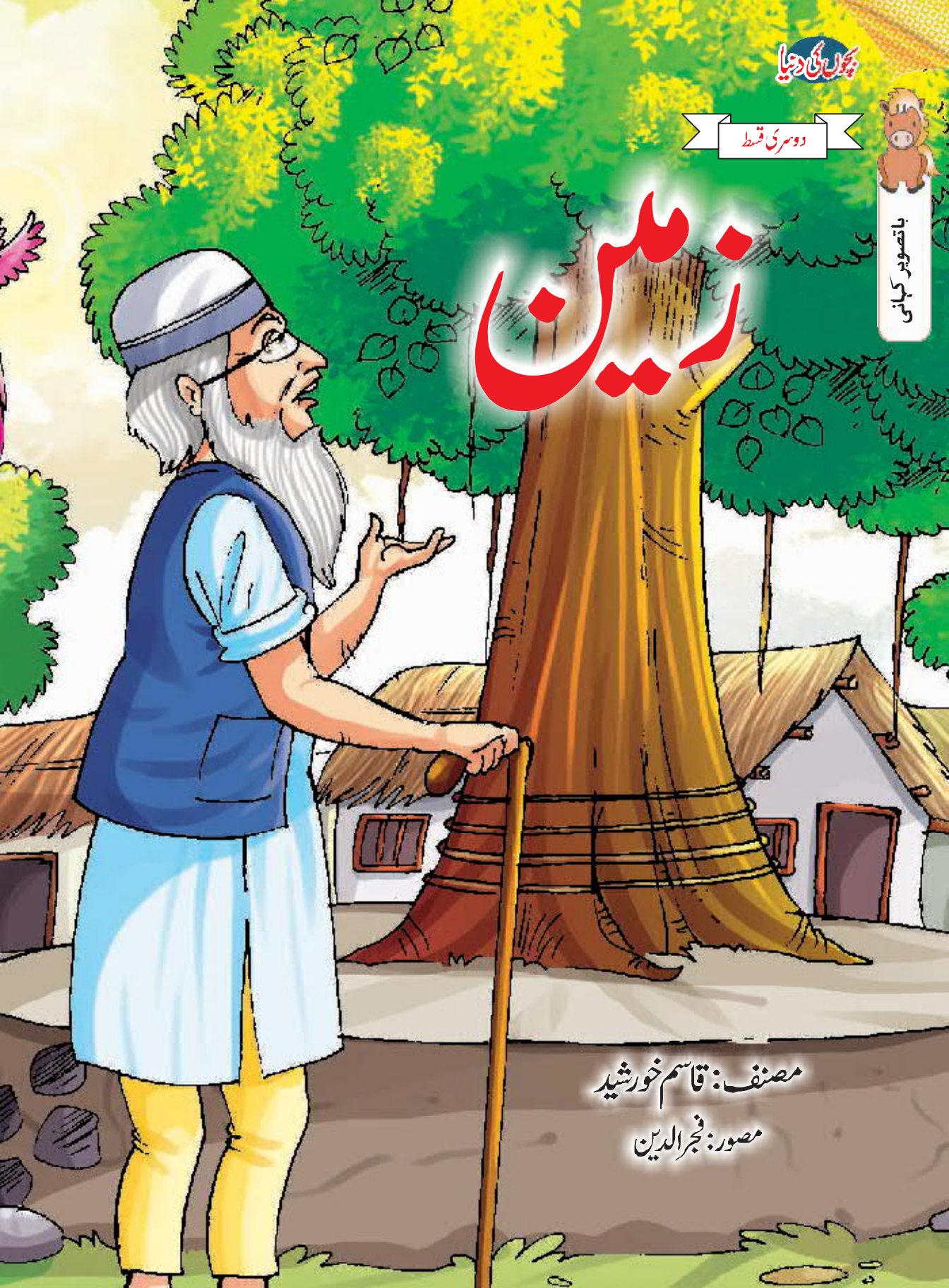

مصنف: قاسم خورشید

مصور: فجرالدین

زمین ہے، ایک دم بنجر ہے۔ ایک بار آپ بھی بولے تھے کہ اس میں کنکر پتھر بہت ہے۔ ہل تک ٹوٹ چکا ہے۔'

'بیٹا یہ تب کی بات تھی جب میں اکیلے کام کیا کرتا تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا میرے ساتھ۔ اب تم دونوں ہو۔ چاہو تو اور مزدور بھی رکھ سکتے ہو۔'

شیخ سلیم کی بیوی پھر ٹپکی.....'اب ای سب دھکو سلا آپ ہی کیجیے۔ ہم لوگوں سے ای سب نہیں ہوگا۔'

'دلہن! تم بیچ میں کاہے کو بولنے لگتی ہو۔'

'کاہے نہیں بولیں؟ تکلیف ہم بھی سہتے ہیں اور پھر روز روز کا بک بک ہم کو بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔'

اب منّو سے بھی نہیں رہا گیا تو اس نے بول دیا.....'چپ بھی رہو اماں۔'

مُنّو کا اتنا بولنا تھا کہ شیخ سلیم نے سارا غصہ اس پر اتار دیا۔ جب اسے کئی تھپّڑ رسید کر چکا تو زبردستی شیخ رمضانی نے اسے چھڑا دیا اور روتے ہوئے مُنّو کا ہاتھ تھام کر گھر سے باہر نکل گئے۔ دونوں درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد مُنّو سسکتے ہوئے اپنے دادا جی کی گود میں سر رکھ کر سو گیا۔

اس تناؤ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شیخ رمضانی جس درخت کے نیچے آ کر بیٹھے ہیں اسے آج سے چالیس سال پہلے انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ جب اپنے کھیت سے وہ یہ پودا لے کر چلے تھے تو ان کے دوست نتھنی رام نے کہا تھا کہ پیپل کا پودا

کا ہے کو لگا رہے ہو۔ آم کا پودا ہوتا تو پھل بھی ملتا۔ تب شیخ رمضانی بولے تھے کہ پیپل کا پیڑ مجھے بھلا لگتا ہے۔ یہ بہت دنوں تک ٹکتا بھی ہے۔ اس کے پتّوں میں جو بات ہے وہ کسی اور میں کہاں؟ اور انھوں نے یہ بھی چاہا تھا کہ یہ پودا درخت بن جائے تو اس کی شیتل چھایا بھی ہوگی۔ بعد میں اس کے نیچے ایک چبوترہ بنوانے کا بھی پلان تھا کہ لوگ شام سویرے بیٹھ سکیں گے۔ کچھ قصہ کہانی ہوتا کہ دل بھی بہل جائے۔

جہاں شیخ رمضانی نے پودا لگایا تھا

جاری.....

بچوں کی دنیا

تیسری قسط

قسط وار

شہر میں ایک جنگل

مصنف: کمارن ست سیوم
مترجم: عباس آصف

قسط وار

پیارے دوستو! آپ نے بچوں کی دنیا میں کئی اچھے اور مشہور ناولوں کو پڑھا ہے۔ اب ہم اس ماہ سے ایک نیا سلسلہ 'شہر میں ایک جنگل' شروع کررہے ہیں۔ اِس کے مصنف کمارن ستیہ سیوم ہیں جو ماحولیات اور جنگلاتی زندگیوں پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کی کتاب میرین میمل آف انڈیا بھی کافی مقبول ہوئی تھی۔ انھوں نے 1990 میں یہ کتاب Forest in the City لکھی تھی۔ اِس کتاب کو ماحولیات پر بچوں کے لیے لکھی کتابوں پر پہلا انعام بھی دیا گیا تھا۔ کمارن ستیہ سیوم آئی آئی ٹی مدراس (چنئی) میں سات برسوں تک رہے تھے۔ آئی آئی ٹی اس وقت 600 ایکڑ سے بھی زیادہ کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور زیادہ تر گھنے جنگلوں پر مشتمل تھا۔ کمارن ستیہ سیوم نے ان جنگلوں میں مختلف تجربات کیے تھے اور ان تجربات کو ہی کتابی شکل دی تھی جسے 'بچوں کی دنیا' میں پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

ولایتی ببول کا جنگل

جھیل کے ایک کنارے پر ایک پرکشش اور عجیب قسم کا جنگل تھا۔ اس جنگل کی خصوصیت یہ تھی کہ اس جنگل میں صرف ولایتی ببول ہی اگتے تھے۔ یہ ببول ہندوستان بھر میں ملتے ہیں۔ یہ جنگلی درخت کے طور پر جھاڑی کی شکل میں اگتا ہے اور اکثر کھیتوں اور باغات کی حفاظت کے لیے حد بندی کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ یہ ہر طرح کی بدسلوکی جھیل جاتا ہے یہاں تک کہ جتنی بار اسے کاٹا جائے اتنی بار پھر اگ آتا ہے اور تیزی سے پھیلتا جاتا ہے۔ چونکہ یہ تنے کے سہارے پھر اُگ آتا ہے، لہٰذا اسے جڑ سے کھود کر کاٹنا پڑتا ہے یا پھر جلانا پڑتا ہے۔ یہ لچک دار اور ڈھیٹ قسم کا درخت اپنی نشوونما کے لیے بہت زیادہ نمی بھی نہیں چاہتا۔

یہ انوکھا جنگلی ببول کا درخت جھیل کے نزدیک علاقے کی محفوظ نوعیت کی وجہ سے اگ آیا تھا۔ جس زمین پر یہ درخت اُگ آیا تھا وہ دراصل کبھی کاشت کی زمین ہوا کرتی تھی جسے آئی آئی ٹی کے احاطے میں شامل کرلیا گیا تھا۔ کھیتوں میں استعمال ہونے والی کھاد میں اس جنگلی درخت کے بیج شامل تھے اور پھر جب ان زمینوں پر آئی آئی ٹی کا قبضہ ہوگیا تو یہ بیج پودے اور درخت کی شکل میں ابھر کر تھوڑے دنوں میں جنگل کی شکل اختیار کر گئے۔

اگرچہ یہ محفوظ علاقہ تھا تاہم اکثر ناجائز طور سے یہاں لکڑی کاٹ لی جاتی۔ آئی آئی ٹی احاطے کی دیوار کے اس پار رہنے والے دیہی آبادی کے باشندگان تقریباً روز ہی دیوار پھاند کر آتے اور درخت کاٹ کر لے جایا کرتے تھے۔ ہم انھیں روزانہ سر پر ڈھیر ساری لکڑیاں کاٹ کر لے جاتے ہوئے دیکھتے۔ یہ ناجائز کاٹ چھانٹ آزادانہ طور پر اس لیے جاری رہتی تھی کہ رکھوالے جنگلی ببول کو بے مصرف درخت خیال

قسط وار

کرتے تھے۔ان کی نظر میں یہ صرف کانٹے تھے۔اسی طرح ہم لوگوں کو بھی ببول کے جنگلوں کا اچھا تجربہ نہ تھا۔ ہر مرتبہ جب ہم سیر کر کے لوٹتے تو ہمیں خراشیں لگی ہوتیں اور ہمارے پاؤں میں کانٹے ہوتے۔

جلد ہی ہم نے صحیح لباس اور جوتے پہننا سیکھ لیے۔ جوزف کی طرح جو ہمیشہ موٹی جینس پہنتا تھا میں نے سوتی پینٹ کا سہارا لیا۔ وینکٹیش ہمیشہ ناموزوں لباس پہن کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ ان جنگلات میں ریشمی کپڑے پہن کر جاتا اور پھر کانٹوں سے اپنی درگت بنواتا۔

زمین پر پڑے ہوئے کانٹے کسی بھی ربڑ سول والے جوتے یا چپل سے گزر جاتے تھے۔خواہ اس کا تلا کتنا ہی دبیز اور موٹا کیوں نہ ہو۔ ہاں چمڑے کے جوتوں پر ان کا اثر نہیں ہوتا تھا۔تاہم کوئی بھی بے فکر نہیں ہوسکتا تھا کہ اس نے چمڑے کے جوتے پہنے ہوئے ہیں لہٰذا اسے کانٹے نہ لگیں گے۔ یہ اکثر ایسی جگہ لگتے جہاں جوتے کا حصہ نہ ہوتا۔ وینکٹیش کے پاس ایسی چپل تھی جس کے تلے ایک انچ موٹے تھے تاہم اس کے چپل کے تلے میں لاتعداد کانٹے چبھ گئے۔ان کانٹوں نے اس کے ربڑ کے تلے میں نکلنے میں دشواری پیدا کی اور اکثر اس طرح چبھتے کہ وہ موقع بے موقع کنگارو کی طرح اچھلنے پر مجبور ہوجاتا۔

لہٰذا ہم جنگلی یا ولایتی ببول کے کانٹوں سے محفوظ رہنے کے لیے کیل کانٹے سے درست ہوکر جنگل میں داخل ہوتے۔ جوزف بہرحال میں آگے آگے چلتا۔ دانتوں میں کوئی پتی چباتے ہوئے وہ ہر پتلی اور تنگ سی گنجائش میں بچتے بچاتے ہوئے چلتا اور ہم سب میں وہی ایسا ہوتا جسے کم سے کم خراشیں آتیں۔تاہم اس کے بال اور داڑھی جو عام حالت میں تراش و خراش سے عاری ہوتی ان میں بے شمار جالے، پتیاں اور تنکے الجھ کر رہ جاتے۔میں اس کے پیچھے چلا کرتا تھا اور اس کے پیچھے ہر ایک انچ جگہ کو اپنے آگے بڑھنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ وینکٹیش سب سے پیچھے ہوتا اور ہم میں سے کسی ایک کو اس کے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کرنے کے لیے جھاڑیوں اور ان کی شاخوں کو پھیلانا اور الگ کرنا پڑتا۔ ساتھ میں اس بات پر بھی نگاہ رکھنی ہوتی کہ جہاں ہم لوگ ہیں وہاں جنگل کا کوئی جانور تو نہیں ہے، ساتھ ہی آگے بڑھنے کے راستے کا بھی تعین کرنا پڑتا۔

ببول کے اس جنگل میں جگہ جگہ گھاس کے قطعات اور کھلے ہوئے میدان بھی تھے۔ان کی موجودگی سے آگے بڑھنے کی جہدِ مسلسل کے دوران تھوڑی سی راحت بھی نصیب ہوجاتی تھی۔ہم نے جھاڑیوں سے گزر کر ان میدانوں تک پہنچنا سیکھ لیا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ولایتی ببول اگرچہ ایک خودرو جنگلی جھاڑی ہے تاہم یہ بہت سے جانداروں کو خورد و نوش کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اس ببول کی جھاڑیوں میں متعدد اقسام کے کیڑے مکوڑے ملتے تھے۔ان میں کنکھجورے، مکڑیاں وغیرہ سبھی کچھ ہوتے تھے۔ جب کبھی کنکھجوروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تو ان درختوں کی پتیاں غائب ہوجاتیں اور یہ بالکل ٹھنٹھ سا دکھائی دیتا تاہم چونکہ یہ پودا اندر سے بہت مضبوط ہوتا ہے لہٰذا چند دنوں میں اس میں پھر سے پتیاں نظر آنے لگتیں۔

کیڑے مکوڑے کو کھانے والی چڑیوں کی بھی بہتات بھرمار تھی اور سفید ابروؤں والی بلبلیں بھی تھیں۔ان کی آواز واضح طور پر تیکھی ہوتی تاہم یہ کہاں بیٹھی ہیں، یہ دیکھ پانا مشکل ہوتا۔موسم میں مگس خور اور اس کے دوسرے بھائی بند بھی یہاں

نظر آتے۔ ان دنوں پابندی سے یہاں قصاب چڑیا بھی نظر آئی جو کسی جھاڑی کے سب سے اوپری حصے پر بیٹھی ہوتی۔ یہ پرندہ بڑی زوردار اور قدرے تیکھی آواز نکالتا ہے۔ قصاب چڑیا کے خطاب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ چڑیا چھوٹے موٹے جانداروں یا کیڑوں مکوڑوں کو ایک قسم کے اپنے نعمت خانے میں محفوظ رکھتی ہے جو کہ چھوٹے پرندوں اور کیڑوں کے شکار کو کانٹوں میں چبھونے سے تیار ہوتا۔

اس ولایتی ببول کے جنگل کے علیحدہ علیحدہ حصوں کو مختلف قسم کی ککو (کوئل) بھی پسند کرتی تھیں۔ ککو کی ذات کے اکثر پرندوں کو میں بہت پسند کرتا تھا اور میں نے پایا کہ ولایتی ببول کے اس جنگل میں متعدد قسم کی ککو چڑیا ہر وقت کیڑے مکوڑوں کی تلاش میں موجود رہتی تھیں۔ ان میں سب سے عام قسم کا پرندہ کوئل تھی۔ کوئل کا رنگ چمک دار سیاہ ہوتا ہے۔ چونچ سبزی مائل زرد اور آنکھیں خون کی طرح سرخ ہوتی ہیں۔ پورا پرندہ ایک دبلے سے کوے کی طرح لگتا ہے تاہم اس کی دم قدرے طویل ہوتی ہے۔ مادہ کوئل تقریباً نر جیسے جسامت رکھتی ہے تاہم رنگ کے لحاظ سے نر سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ بھوری چتیوں دار ہوتی ہے اور سفید دھاریاں بھی ہوتی ہیں۔ چونکہ ککو کنبے کی یہ سب سے عام قسم ہے، قصبات و شہروں میں بھی ملتی ہے لہٰذا کوئل کی مخصوص آواز سے سبھی واقف ہوتے ہیں۔ یہ کو، کو، کی زوردار آواز نکالتی ہے اور بولتے بولتے تیز چیخ جیسی آواز کے ساتھ کو کو، کا سلسلہ ختم کر کے تھوڑے وقفے کے بعد پھر کو، کو، کرنے لگتی ہے۔

کوئل کی قسم میں ایک ایسی نسل بھی ہے جو باز کوئل کہلاتی ہے۔ یہ چڑیا سرمئی اور بھورے رنگ کی ملی جلی رنگت لیے ہوئے ہوتی ہے اور پہلی نظر میں باز سے ملتی جلتی نظر آتی ہے لہٰذا اس کا نام باز کوئل پڑ گیا ہے۔ اس چڑیا کو برین فیور (Brain fever) کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بولتے وقت اس کی آواز سے ایسا لگتا ہے جیسے 'برین فیور'، 'برین فیور' یعنی دماغی بخار، دماغی بخار کی رٹ لگائے ہو۔ یہ بولتے ہوئے

آواز اونچی کرتی جاتی ہے۔ پھر اچانک خاموش ہو جاتی ہے۔

بعد ازاں پھر وہی رٹ لگانے لگتی ہے۔ یہ رات میں بھی بولتی ہے۔ کبھی کبھی میں نے اسے رات کے دو بجے بھی اسی طرح چیختے ہوئے سنا ہے۔ اس وقت میں تجربہ گاہ میں طویل تجربات کے بعد سستان سڑک پر سائیکل چلاتا ہوا لوٹ رہا ہوتا تھا۔

میں نے ولایتی ببول کے اس جنگل میں ککو قبیلے کی سب سے بڑی چڑیا بھی دیکھی ہے۔ یہ چڑیا مہوک کہلاتی ہے۔ یہ ایک بڑے کوے کے برابر ہوتی ہے اور اپنے بازوؤں کے پروں کی وجہ سے کوے سے مختلف نظر آتی ہے۔ اس کے بازوؤں کا رنگ چھالیہ جیسا قدرے سنہرا اور کتھئی ہوتا ہے۔ اس کی دم لمبی اور جھنتا رہوتی ہے۔ یہ چڑیا پرواز میں کمزور ہوتی ہے۔ جب کبھی میں اس پرندے کو ایک درخت سے دوسرے درخت پر اڑ کر جاتے ہوئے دیکھتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا میں پاگل ڈرائی کولا کو اس کے قید خانے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اس کے سرخ پر یقینی طور پر ایک چوغہ کا سا تاثر دیتے ہیں۔ تاہم مہوک کو سست پرندہ نہ سمجھا جانا چاہیے۔ یہ جس وقت غذا کی تلاش میں درختوں اور جھاڑیوں کی شاخوں میں گھوم رہا ہو، اس وقت اس کی پھرتی قابل دید ہوتی ہے۔ اس کی غذا میں کنکھجورے چھپکلیاں، چھوٹی چوہیا اور چڑیوں کے انڈے شامل ہیں۔

ولایتی ببول کے جنگل میں ہم نے ایک دوسرے قسم کی ککو بھی دیکھی یہ سبز چونچ والی ملکو با خاصی شرمیلی چڑیا تھی۔

ککو کی مختلف اقسام کی چڑیوں میں ملکوہا اور مہوک ہی ایسی دو چڑیاں ہیں جو اپنا علاحدہ گھونسلا از خود بناتی ہیں اور اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہیں۔ ککو کی نسل کی بہت سی چڑیاں دوسرے پرندوں کے سہارے اپنے بچے پالتی ہیں۔ ان چڑیوں کے انڈے دینے کا موسم وہی ہوتا ہے جو دوسری چڑیوں کا ہوتا ہے نیز ان کے انڈوں کے رنگ بھی تقریباً ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ دوسرے پرندوں کے انڈوں کے ہوتے ہیں۔ میزبان چڑیا اپنے انڈوں کے ساتھ ان چڑیوں کے انڈے بھی سیتی ہے۔ عام طور پر ککو کی بیشتر نسلیں میزبان پرندے کی عدم موجودگی میں اس کے گھونسلے میں انڈے دے آتی ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ککو کا جوڑا میزبان پرندے کو گھونسلے کے پاس منڈلاتا رہتا ہے۔ میزبان پرندہ انھیں بھگانے کے لیے پیچھے دوڑتا ہے۔ ککو کا نر انھیں دور لے جاتا ہے۔ اسی دوران مادہ ککو گھونسلے میں اپنے انڈے خاموشی سے رکھ دیتی ہے۔ میزبان پرندہ اپنے انڈوں کے ساتھ ککو کے انڈے بھی سیتا ہے۔ عام طور پر ککو کا بچہ انڈوں سے پہلے نکل آتا ہے۔ پرندہ بقیہ انڈے از خود باہر پھینک دیتا ہے۔ اس طرح ننھے بچوں کو جو دراصل ککو کے بچے ہوتے ہیں، میزبان پرندے کے جوڑے کی پوری توجہ مل جاتی ہے اور وہ بڑی لگن سے ان کی پرورش کرتا ہے۔ اکثر ان بچوں کی جسامت پالنے والوں سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے مگر وہ اپنے مادرانہ جذبے کے تحت اسے پالتے جاتے ہیں۔

آئی آئی ٹی میں ایک قسم کی ککو کو دیکھ کر میں خاص طور پر خوش ہوا۔ یہ خوبصورت سرخ بازوؤں والی چوٹی دار ککو بھی۔ اس چڑیا کا نام اس کے رنگ روپ سے خاصی مناسبت رکھتا ہے۔ یہ پتلی لمبی ہوتی ہے اور پونچھ خاصی لمبی ہوتی ہے۔ چوٹی خاص طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ رنگ گہرا چمکیلا ہوتا ہے تاہم گردن کے پچھلے حصے میں گول دائرہ کا لرنما سفید رنگ بھی ہوتا ہے اور اس کے بازوؤں کا رنگ چھالیہ سے مشابہ یعنی مہوک

جیسا ہوتا ہے۔

اس کی ٹھوڑی اور گلے کا رنگ سنگترے کے رنگ اور بقیہ نچلا دھڑ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ اپنے خوبصورت رنگ و روپ کے علاوہ میں نے اس کے بارے میں اور جانکاری حاصل کی اور اس کے نقل مکانی کرنے کے متعلق یقین سے بہت کم ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ یہ ہمالیائی ترائی کے علاقے کا پرندہ ہے اور شمالی و شمال مشرقی ہندوستان میں اس کی افزائش ہوتی ہے۔ موسم سرما میں یہ ملک کے جنوبی حصے کا سفر بہت کم ہی کرتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ میں نے جس سرخ چوٹی دار ککو کو دیکھا تھا وہ ہر حال میں مدراس ضرور آتا ہے کیونکہ میں نے لگاتار تین موسموں میں اس کی موجودگی ریکارڈ کی تھی۔

ولایتی ببول کے جنگل کے اس پار بھی ہم گئے تھے تاہم اوپن بل سارس معاملے میں ہمیں شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اوپن بل سارس کیمپس کے سب سے بڑے پرندے تھے۔ ڈھائی فٹ بلند اور لمبائی تین فٹ ہوتی تھی۔ یہ لمبی اور بڑی قسم کی بطخ ہے۔ اڑتے وقت یہ گدھ سے مشابہ نظر آتا ہے۔ تاہم اپنی لمبی گردن اور پیچھے کو پھیلائی ہوئی ٹانگوں کی وجہ سے آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ یہ عام طور پر سفید پرندہ ہوتا ہے جس کے پنکھ، دُم اور اوپری حصے سیاہ ہوتے ہیں۔ اس کا نام اس کی ساخت کی مناسبت کے مطابق۔ اوپن بل، سارس، مینڈک، کیڑے، گھونگھے اور کیکڑے کھاتا ہے۔ یہ اپنے جبڑے کے بیچ کے فاصلے کو گھونگھے کے خول سے اس کے رم حصے کو نکالنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ سارس یہ کام اتنی صفائی اور مہارت سے کرتا ہے جس کے لیے یہ مشہور ہے۔

آئی آئی ٹی کے اوپن بلز (Openbills) صرف ببول کے جنگل میں ہی آتے ہیں۔ مہینوں ان کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ وہ اپنی آمد کے پیچیدہ نظام پر عمل کرتے ہیں۔ سال کے ایک موسم میں اوپن بلز کا گروپ صرف دن کے وقت ببول کے جنگل میں آتا ہے۔ میرے خیال میں وہ خوراک کی تلاش میں وہاں آتے ہیں کیونکہ اس کے علاوہ ان

کی وہاں آمد کی کوئی دوسری وجہ نظر نہیں آتی۔ (میں نے انھیں کبھی کھاتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ وہ ہمیشہ ببول کے پیڑ کے اوپر بیٹھے ہوئے نظر آئے) اس عرصے کے دوران کوئی ایسا لمحہ ہوتا ہوگا جب اوپن بل کوئی کام کرتے ہوں گے۔ وہ شام کے وقت بسیرے کے لیے وہاں آتے اور صبح ہوتے ہی جنوب کی جانب کہیں چلے جاتے، شاید خوراک کی تلاش میں، اپنی سرگرمیوں کے تیسرے مرحلے میں اوپن بلز مہینوں آئی آئی ٹی نہیں آتے۔

ان اوپن بلز کے جائزے کے دوران کئی سوالات پیدا ہوئے جن کے جوابات نہیں مل سکے جیسے اوپن آمد کے پہلے مرحلے میں جب وہ وہاں خوراک کی تلاش میں آئے تو انھوں نے اسے اپنا بسیرا کیوں نہیں بنایا؟ کیا اس وقت ایسا کرنے میں کوئی چیز مانع تھی؟ اگر مانع تھی تو اپنی آمد کے دوسرے مرحلے میں انھوں نے اسے رات میں اپنا بسیرا کیوں بنایا؟ اپنے آخری مرحلے میں وہ کہاں جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ کیا کرتے ہیں؟ وہ کہاں اور کب اپنی نسل کی افزائش کرتے ہیں؟

اوپن بلز اپنے بسیرے کے لیے گھنے ببول کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں وہ ٹھہرتے ہیں وہ علاقہ پانی سے بھرا اور گندے نالے کے قریب ہوتا ہے جو ان کے لیے کافی محفوظ مقام ہوتا ہے، جس وقت وہ کھا رہے ہوتے ہم نے ان کا قریب سے جائزہ لینے کے لیے کئی بار اس علاقے میں جانے کی ناکام کوششیں کیں۔

یہ نالے دوسرے جاندار کے لیے بھی کافی موزوں جگہ تھے کیونکہ اس جگہ کافی مقدار میں گھونگھے اور دوسرے کیڑے مکوڑے ملے۔ ہم نے اس جگہ مختلف سمتوں سے پہنچنے کی کئی بار کوشش کی اور کانٹوں کی باڑ کو بھی عبور کیا لیکن ہر بار چکنے بدبودار کیچڑ اور جھاگ والے پانی نے ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا اور ہر بار ہم صرف اوپن بلز کو خوفزدہ ہی کر سکے جو ہماری آمد سے باخبر تھے اور ہمیں قریب دیکھ کر فضا میں اڑ جاتے اور اپنی پرواز کا دلچسپ نظارہ ہمیں دکھاتے۔ میں نے اور وینکٹیش نے اوپن بلز کی پناہ گاہ تک پہنچنے کی آخری کوشش کی۔ پانی کے مسئلے کے حل کے لیے اپنے جوتوں کو پالی تھن سے اچھی طرح باندھ لیا تاکہ جوتے اور کپڑے خراب نہ ہوں لیکن پانی میں جاتے ہی پالی تھن کے تھیلے پھٹ گئے، میرے جوتے اور پتلون دونوں ہی گندے ہو گئے اور اس طرح ہمیں پھر ناکامی ہوئی۔

اوپن بلز کی پناہ گاہ تک پہنچنے میں ناکامی کی وجہ سے ہم نے ببول کے جنگل کا قریب واقع سب سے اونچی عمارت کی چھت سے جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ ببول کے درخت عمارت سے چھوٹے تھے اس لیے ہم نے عمارت کی چھت سے ان پر پوری طرح نگاہ رکھی۔ خاص مہینوں میں ببول کے درختوں پر کم و بیش 500 پرندے بسیرا کر سکتے ہیں۔ شام کے وقت ان پرندوں کا فضا کی بلندیوں سے ان درختوں کی جانب آنے کا نظارہ قابلِ دید ہوتا ہے۔ اس دل فریب نظارے کی وضاحت ہینڈ بک آف انڈین برڈس آف انڈیا اینڈ پاکستان میں اس طرح کی گئی ہے ''فضا کی بلندیوں سے نیچے آنے کا نظارہ بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ تنی ہوئی گردن، اوپر اٹھے ہوئے سر، نصف کھینچے ہوئے پنکھ، کچھ لٹکے ہوئے پیر جو توازن برقرار رکھنے کے لیے آگے پیچھے حرکت کرتے رہتے ہیں جیسے کہ فضا میں چل رہے ہوں اور اچانک یہ جھنڈ کسی درخت پر جا بیٹھتا ہے اور بیٹھنے سے قبل پروں سے زبردست شور پیدا کرتا ہے۔''

آئی آئی ٹی میں جب ہم نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تو میں جوزف اور وینکٹیش کے ہمراہ کنیا کماری کے نزدیک ناگرکوائل

معروف شاہراہ پر واقع مقام مندر پو گیا۔ مندر پو، ترونیلو پلی سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ گاؤں اپنے آپ میں بہت چھوٹا ہے اور یہاں کی کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے۔ اس کی واحد خصوصیت یہ ہے کہ اسے اوپن بل (کھلی چونچ) پرندوں کے بھائی بند رنگین بگلوں نے اپنا گھونسلہ بنانے کے لیے منتخب کر رکھا ہے۔ بس سے اترنے کے بعد ہم نے خوشگوار منظر یہ دیکھا کہ بگلے شاہراہ سے ایک دم نزدیک ترین واقع درختوں پر اپنے گھونسلے بنا رہے تھے۔ بہتیروں نے اپنے گھونسلے مکمل کر لیے تھے۔ صرف 4 یا 5 درختوں پر تقریباً 100 گھونسلے نظر آئے۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اگر ہم لوگ چند ہفتے قبل یہاں پہنچتے تو ہم ان سے بھی کہیں زیادہ تعداد میں بگلے اور ان کے گھونسلے دیکھ سکتے تھے۔

رنگین بگلے کی بات یہ ہے کہ یہ 'اوپن بل' سے قدیں بڑا ہوتا ہے اور اس کا چہرہ اس کی چونچ زرد رنگ کی ہوتی ہے جبکہ اوپن بل کا رنگ قدرے مختلف ہوتا ہے۔ جسم کا بقیہ حصہ سفید ہوتا ہے۔ رنگین بگلے کے بازوؤں پر سیاہ رنگ کے پر ہوتے ہیں نیز اس کے کندھوں اور اڑان والے پروں میں گلابی رنگ کے پر ہوتے ہیں۔ مندر پو کے بگلے اپنے گھونسلوں میں یا تو بچوں کو چارا کھلا رہے تھے یا پھر گھونسلوں میں بیٹھ کر گھونسلوں کی حفاظت کرتے نظر آئے۔ وہ آتی جاتی گاڑیوں کے شور سے قطعاً متاثر نہیں تھے جبکہ سڑک پر آنے جانے والی موٹر گاڑیوں کے ہارنوں سے اچھا خاصا شور برپا تھا۔ یہاں تک کہ جیسا ہم ان کے نزدیک پہنچے اور ان سے صرف چند فٹ کے فاصلوں پر رہ گئے تو بھی انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی بلکہ وہ شاخوں کی آڑ سے بڑی دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

ہم نے مندر پو میں بگلوں کے بچوں اور گھونسلوں کا معائنہ کرتے ہوئے بڑے اطمینان سے وقت گزارا۔ ہر گھونسلے میں تقریباً تین بچے ضرور تھے۔ بگلوں کے جوڑوں میں سے ایک گھونسلے میں بیٹھ کر سورج کی تیز روشنی سے بچوں کی حفاظت کر رہا تھا اور دوسرا بچوں کے لیے خوراک لانے پر معمور تھا۔ اس طریقے سے دونوں پرندے باری باری سے ڈیوٹیاں بدل کر بچوں کی پرورش کر رہے تھے۔ باہر سے آنے والا بگلا گھونسلے میں آ کر نگلی ہوئی غذا گھونسلے میں اُگل دیتا تھا۔ بچے اس غذا کو جلدی جلدی کھا کر ختم کر دیتے تھے۔ بعض گھونسلوں میں زیادہ بے چین اپنی ماں یا باپ کی چونچ سے ہی براہِ راست غذا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آئے۔ یہ بچے اپنے والدین کے مقابلے میں ایک ہی رنگ کے نظر آئے اور ان کے چھدرے پر دیکھ کر ایسا لگا کہ جیسے انھوں نے جگہ جگہ سوراخ والی سوئٹر پہن رکھی ہے۔ ان سب کے باوجود ہر چھوٹے جانور کی طرح ان بچوں میں بھی ایک فطری کشش تھی۔ ہم نے کچھ ایسے بچے بھی دیکھے جو اپنے گھونسلوں سے گر کر نیچے مرے پڑے تھے۔

جوزف نے ہر ممکن زاویے سے بگلوں کے فوٹو لیے۔

ایک درخت کے نزدیک پتھر کی ایک دیوار پر چڑھ کر جوزف نے اوپر بگلوں کے فوٹو لیے۔ اس کے بعد ہم واپسی کے سفر کے لیے تیار ہوئے اور نزدیک واقع 'ٹی اسٹال' پر بیٹھ کر بس کا انتظار کرنے لگے۔ چائے پیتے ہوئے ہم نے ٹی اسٹال کے مالک سے بگلوں کی سرگرمیوں سے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ جہاں تک وہ جانتا ہے خشک سالی والے برسوں کے علاوہ گزشتہ 20 برسوں سے اس علاقے میں بگلے برابر اپنے گھونسلے بناتے آئے ہیں۔ خشک سالی والے برسوں میں بگلے افزائش نسل نہیں کرتے، یہ بات واضح تھی کہ رنگین بگلے اپنے تجربے سے یہ بات جان گئے تھے کہ گاؤں کے لوگ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور وہ بے کھٹکے ہر سال اس گاؤں میں آتے تھے۔ ہم نے ببول کے ان جنگلوں میں بہت سے دیگر دلچسپ جانور دیکھے۔ مثال کے طور پر یہاں گیدڑ بھی تھے۔ یہ جانور ولایتی ببول کے اس جنگل میں گھنی گھاس میں چھپے رہتے تھے۔ یہ جانور بڑی دلچسپی سے بیٹھے ہوئے ہمیں دیکھا کرتے تھے۔ جب ہم ان کے بہت نزدیک چلے جاتے تو وہ اس انداز سے اٹھتے گویا کہہ رہے ہوں کہ بھئی اب تو ہمیں جانا ہی پڑے گا اور اسی جھاڑی میں غائب ہو جاتے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ میں اور وینکٹیش ایک گیدڑ کے اوپر تقریباً چڑھ ہی گئے تھے جو راستے کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ اس گیدڑ نے کسی دوسرے جانور کی طرح خوف زدہ ہونے کا ہرگز کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ جیسا کہ خرگوش وغیرہ کیا کرتے ہیں۔ بس اٹھ کر راستے کے کنارے کی ایک پہاڑی میں آہستہ آہستہ داخل ہو گیا۔ اگرچہ ہم نے اس کا پیچھا کیا مگر تھوڑی دیر بعد وہ ہماری نظروں سے غائب ہو گیا۔ گیدڑ گھریلو کتے سے بہت حد تک ملتا جلتا ہوتا ہے اور اس میں ہمارے آوارہ کتوں کی سی جھلک ملتی ہے۔ اس کے جسم پر سیاہ بھورے اور چتکبرے بال ہوتے ہیں مگر پونچھ جھبری اور قدرے نیچے جھکی ہوتی ہے۔ جبکہ کتے کی دم اوپر کی جانب مڑی ہوئی ہوتی ہے۔ گیدڑ تقریباً ہر قسم کے ماحول میں مرعوب جنگلات سے لے کر خشک میدانوں تک میں ملتے ہیں۔ گیدڑ پہاڑی مقامات اور 3500 میٹر بلند پہاڑوں میں بھی دیکھے گئے ہیں۔ بہت سے لوگ شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ گیدڑ قصبوں اور گاؤں کے اردگرد ہی رہتے ہیں۔

گیدڑ عام طور پر چھوٹے اور بیمار جانوروں کو شکار کر کے کھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گدھوں والا کام بھی کرتے ہیں یعنی مردہ جانوروں پر سے گوشت اتار کر کھا جاتے ہیں اور اس طرح سے بنی نوع انسان کی مفت خدمت کرتے ہیں۔ آئی آئی ٹی میں گیدڑ اپنی پناہ گاہوں سے رات ہی میں نکلتے تھے اور انھیں رات کے وقت بڑی آسانی سے سڑک پار کرتے ہوئے یا اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ آدھی رات کے لگ بھگ رہائش گاہوں اور ہوٹلوں کے نزدیک واقع کوڑا گھروں میں آ کر غذا تلاش کیا کرتے تھے۔ لیکن جیسے ہی وہ نزدیک آتے ان کے بھائی بند یعنی کتے ان سے اپنی روایتی دشمنی ضرور نکالتے۔ گیدڑوں کی ہوں، ہوں اور کتوں کی غراہٹ اور بھونکنے کی آواز اس شبانہ جنگل کا پتہ دیتی تھی۔ یہ بات سب جانتے تھے کہ گیدڑ اور کتے کبھی کبھی چتکبرے اور سیاہ ہرن کو مار بھی ڈالتے ہیں۔ یہ کام وہ لوگ ایک جتھے کی شکل میں جانور کو گھیر کر کیا کرتے تھے۔

جاری.....

■

ماخذ: شہر میں ایک جنگل، **مصنف:** کمرن ست سیوم، **مترجم:** عباس آصف، **مصور:** بی جی ورما، **ناشران:** چلڈرن بک ٹرسٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بچوں کا ادبی ٹرسٹ

اتحاد

بہت عرصے پہلے کی بات ہے، کسی جنگل میں بہت سارے جانور رہتے تھے جن میں شیر، ہاتھی، لومڑی، بھیڑیا وغیرہ اور دیگر کئی جانور تھے۔ روزانہ ان کے جنگل میں منگل کا سماں رہتا تھا۔ ہر جانور پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ پتہ نہیں اس خوبصورت جنگل کو کس کی نظر لگ گئی۔ یہاں جانور کم سے کم ہوتے جارہے تھے۔ وہ اس لیے کہ جنگل کے قریب ہی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں چند شکاریوں نے آکر بسیرا کر رکھا تھا۔ وہ شکاری روزانہ کئی جانور اور پرندوں کو ہلاک کرکے بہت خوش ہوتے تھے۔ لومڑی تو اپنی چالاکی کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ بس بھئی لومڑی نے چند ہی دنوں میں پتہ لگا لیا کہ شکاری کہاں سے آتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ لومڑی اور بھی کئی راز معلوم کرچکی تھی۔ وہ سب باتیں اکٹھی کرکے جنگل کے بادشاہ شیر کے پاس گئی اور شیر کو حالات سے آگاہ کیا اور ساری تفصیل بتائی کہ یہ لوگ ہمارے جنگل سے قیمتی جانوروں اور پرندوں کا شکار کرکے ان کو مارکیٹ میں فروخت کرتے ہیں۔ شیر نے کہا کہ میں بھی بہت پریشان تھا اپنے جنگل کے حالات سے۔ لہٰذا اب میری پریشان تم نے حل کردی۔ اب میں آسانی سے ان شکاریوں سے چھٹکارا حاصل کرلوں گا۔ بس بھئی ہونا کیا تھا شیر نے ایک دن مقرر کردیا اور کہا کہ اس دن ہماری میٹنگ ہوگی۔

وہ دن آگیا جس دن شیر نے میٹنگ کرنے کو کہا تھا۔ شیر کے دربار میں پورے جنگل کے جانوروں نے حاضری دی اور سب فیصلے کے منتظر تھے۔ جب بادشاہ شیر آیا تو سب جانور احتراماً کھڑے ہوگئے۔ شیر نے ہرن کو کھڑا کرکے پوچھا کہ تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو تو شکاریوں نے کچھ نہیں کہا؟ ہرن نے روتے ہوئے کہا کہ میرے بھائی اور میری بہن ان ظالم شکاریوں نے شکار کرلی۔ شیر نے اور جانور مثلاً ہاتھی اور

چیتا اور بکری وغیرہ سے پوچھا۔ سب کے بعض احباب ظالم شکاریوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں تو شیر نے کافی دیر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کل صبح جب وہ شکاری آئیں گے تو ہم تمام جانوروں کو جنگل کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لینا ہے اور ان شکاریوں کی خوب پٹائی کرنی ہے۔ تمام جانور صبح ہونے کے انتظار میں تھے کہ جلد صبح ہو اور ہم اپنا اپنا حساب چکائیں اور امید بھری صبح ہوگئی۔ تمام جانور بالکل تیار کھڑے تھے۔ جیسے ہی ظالم شکاری جنگل میں قہقہے لگا کر داخل ہوئے تو اپنے سامنے جنگل کے بادشاہ شیر کو پایا وہ خوف کے مارے پیچھے ہوئے تو جانوروں کا ساتھی ہاتھی آ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان شکاریوں کو پورے جنگل کے جانوروں نے گھیرے میں لے لیا اور اتنی پٹائی کی کہ پوچھیے مت۔ تمام جانوروں نے خوب جی بھر کر مارا اور ہاتھی نے ان کی تمام بندوقوں پر پیر رکھ دیا جس سے وہ بندوقیں ناکارہ اور خراب ہوگئیں اور وہ تمام شکاری دم دبا کر بھگ کھڑے ہوئے اور شکاریوں نے توبہ کرلی کہ آئندہ وہ اس جنگل کا رخ نہیں کریں گے۔ چند ہی دنوں بعد وہ جنگل کے قریب کا گاؤں بھی چھوڑ کر کہیں دور چلے گئے۔

اگلے روز جنگل میں پھر دوبارہ خوشیاں واپس آگئیں اور تمام جانوروں نے یہ عہد کرلیا کہ ہم آئندہ بھی اسی طرح اتحاد سے کام لیں گے۔ اتحاد اور بھائی چارے میں طاقت ہے اور اگر ہم ایک ہوکر رہیں تو بڑے سے بڑے دشمن کا بھی مقابلہ کرسکتے ہیں۔

■

Peerzada Mehrajuddin
Post Office Sallar
Pahalgam - 192402 (Kashmir)

شیخ فہد عبدالموحد

والد

- والد دنیا کا وہ واحد شخص ہے جو خود سے زیادہ آپ کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔
- والد چاہے کتنا ہی بوڑھا ہو، گھر کا سب سے مضبوط ستون ہوتا ہے۔
- باپ کی موجودگی سورج کے مانند ہوتی ہے، سورج گرم تو ضرور ہوتا ہے مگر سورج نہ ہو تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔
- باپ اولاد کے لیے ڈھال ہے جو کبھی اپنی اولاد سے غافل نہیں ہوتا۔
- باپ ایک ایسا کریڈٹ کارڈ ہے جو بیلنس نہ رکھنے کے باوجود بھی ہمارے خواب پورے کرنے کی کوشش ہے۔
- والد کا سخت انداز اور ماں کا نرم لہجہ ہمارے معاشرے میں گھر کے ماحول کو معتدل و متوازن رکھتا ہے۔
- باپ کے آنسو تمھارے دکھ سے نہ گریں، ورنہ اللہ تم کو جنت سے گرادے گا۔
- باپ کا حکم مانو تاکہ خوش حال ہوسکو، باپ کی سختی برداشت کرو تاکہ باکمال ہوسکو۔
- باپ ایک ذمہ دار ڈرائیور ہے جو گھر کی گاڑی کو اپنے خون سے چلاتا ہے۔
- ماں کے پاؤں تلے جنت ہے لیکن یاد رکھو! باپ کی ناراضگی تمھیں جہنم میں نہ پہنچادے۔
- باپ کی باتیں غور سے سنو تاکہ دنیا والوں کی نہ سننی پڑے اور باپ کے سامنے نظر جھکا کر رکھو تاکہ اللہ تم کو دنیا میں بلند کردے۔

■

Shaikh Fahad Abdul Mowahhid
Mahapoli (Maharashtra)

آصفیہ خان

پھلواری کا شوق

نازیہ کو پھولوں کا بہت شوق تھا۔ وہ جب بھی پھولوں کو دیکھتی، خوش ہوجاتی۔ اس نے اپنے گھر میں بھی بہت طرح کے پھول لگا رکھے تھے جیسے گلاب، چمپا، چنبیلی، سورج مکھی، گل داؤدی اور کچھ پودے جو صحت کے لیے بہت اچھے ہوتے ہیں جیسے تلسی اور الوویرا لیکن نازیہ کے والدین کو پھول پھلواری کا بالکل بھی شوق نہیں تھا۔ نازیہ کے والد تو پھول پھلواری کو مچھروں اور کیڑے مکوڑوں کا گھر سمجھتے تھے۔ انھیں نازیہ کا یہ شوق بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ ایک بار جب ڈینگو ملیریا کی مہاماری چلی تو نازیہ کے والد نے ڈینگو اور ملیریا کے ڈر سے ساری پھلواری نکلوادی۔ نازیہ اس بات سے بہت اداس ہوگئی۔ اسے اپنے باغ کو دیکھنا، پانی دینا، روز شام کو اپنے پھولوں سے بھرے آنگن میں بیٹھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ جو آنگن کبھی پھولوں سے سجا اور مہکتا رہتا تھا آج ویران پڑا تھا۔ نازیہ کو اپنے آنگن میں پھولوں پر منڈلاتیں تتلیاں اور پتنگے بہت اچھے لگتے تھے اور اب تتلیاں اور پرندے شاید ہی کبھی دکھائی دیتے تھے۔ ایک دن اچانک نازیہ کے والد کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ ان کا کافی علاج کیا گیا پر ان کی صحت میں کوئی سدھار نہیں آیا۔ نازیہ اور اس کی والدہ بہت پریشان تھے۔ پھر ایک دن کسی رشتے دار نے ایک بہت بڑے حکیم جی کے بارے میں نازیہ کی والدہ کو بتایا۔ حکیم جی نے جب نازیہ کے والد کو دیکھا تو بتایا کہ نازیہ کے والد کی طبیعت بہت خراب ہے اور ان کا علاج صرف ایک پھول گل خیرو کے رس سے ہی ہوسکتا ہے اور انھیں شفا مل سکتی ہے۔ میرے پاس تو فی الحال ہے نہیں، پر آپ کو یہ کہیں بھی آرام سے مل جائے گا۔ نازیہ کے والدین نے پھول بہت تلاش کیا پر انھیں نہیں ملا۔ جب یہ بات نازیہ کو معلوم ہوئی تو اس نے کہا کہ اسے پتا ہے یہ پھول کون سا ہے اور کہیں ملے گا۔ نازیہ نے بتایا یہ پھول میرے اسکول میں لگا ہوا ہے میں کل لے کر آؤں گی۔ نازیہ اگلے دن ٹیچر کی اجازت سے کافی سارے گل خیرو اپنے والد کے لیے لے کر آئی۔ نازیہ نے بتایا کہ اسکول میں پھول کا نام انگریزی میں اور اردو میں گل خیرو لکھا ہے، اس لیے جب نام بتایا تو وہ سمجھ گئی کون سا پھول ہے۔ روز اس پھول کا رس پینے سے نازیہ کے والد کی طبیعت بھی اچھی ہوگئی۔ ایک دن انھوں نے نازیہ سے کہا کہ انھوں نے پھلواری نکال کر بہت برا کیا۔ پھول پھلواری سے گھر کی سجاوٹ بھی ہوتی ہے اور فضا بھی اچھی رہتی ہے۔ رہی بات مچھروں اور کیڑے مکوڑوں کی تو ان سے بچنے کے لیے ضروری احتیاط رکھنی چاہیے۔ جیسے دروازے کھڑکی بند رکھنے چاہئیں اور پانی کھلا نہیں رکھنا چاہیے۔ مجھے معاف کردو اور تم جتنے مرضی چاہو اتنے پھول لگا سکتی ہو۔ نازیہ بہت خوش ہوئی اور اس کے آنگن میں پھر سے رونق آگئی۔ ■

Asfia khan
Jamia Nagar
New Delhi - 110025

حارث انصاری برہانپوری

عرشیہ کی گڑیا

عرشیہ پانچویں جماعت کی طالبہ تھی جو کہ گاؤں کے اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہ نہایت ذہین اور حاضر جواب تھی جب بات کرتی تو لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے، اسی لیے گھر والوں کے ساتھ ساتھ ٹیچرس کی بھی بہت چہیتی تھی۔

اسے گڑیوں سے بہت محبت تھی۔ اس کے پاس کئی طرح کی گڑیاں تھی جنھیں وہ بڑے ہی سلیقے سے سجا کر رکھتی تھی۔ ایک دن وہ اپنے والد کے ساتھ شہر میں میلہ دیکھنے گئی جہاں اس نے ایک ایسی گڑیا دیکھی جو نہ صرف قد میں اس کے برابر تھی بلکہ بہت حد تک اس سے مشابہ بھی تھی۔

عرشیہ اسے لینے کی ضد کرنے لگی۔ اس کے والد نے وہ گڑیا خرید کر اسے دے دی۔ اور پھر وہ واپس گاؤں آ گئے۔ اب عرشیہ بے حد خوش تھی۔ گھر آ کر اس نے فوراً شیرین، پری، صدف، تبسم، سعدیہ اور الفیہ کو اپنے گھر بلایا اور سب کو اپنی گڑیا دکھانے لگی۔ عرشیہ نے اپنی گڑیا کی گانا گانے، پلکیں جھپکانے وغیرہ خصوصیات کو اجاگر کیا تو سبھی نے گڑیا کی بہت تعریف کی۔ تبھی تبسم بولی: ''میں نے سنا ہے کہ ایسی گڑیا رات کو اٹھ کر چلتی ہے اور اپنے ساتھ برا سلوک کرنے والوں سے بدلہ لیتی ہے۔'' صدف اور پری نے تبسم کی ہاں میں ہاں ملائی مگر عرشیہ اور سعدیہ اس کی بات سن کر ہنسنے لگیں اور کہا: ''ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔'' عرشیہ نے اپنی گڑیا کو ایک تھپڑ بھی مارا اور ہنسنے لگی۔

رات ہو چکی تھی۔ عرشیہ کی سہیلیاں اپنے اپنے گھر جا چکی تھیں۔ عرشیہ بھی اپنے کمرے میں سونے چلی گئی۔ رات کے دوسرے پہر اچانک عرشیہ کی نیند کھلی۔ اس نے محسوس کیا کہ باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور کبھی کبھار بجلی کی تیز گرجدار آواز بھی گونج اٹھتی تھی۔ عرشیہ اٹھی اور اس نے اپنے کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ اس کی گڑیا جسے وہ سونے سے پہلے کھلونوں کی الماری میں رکھ آئی تھی اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی، اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور چمک رہی تھیں۔ اس نے بڑے ہی خوفناک لہجے میں کہا: ''عرشیہ تو گڑیا کا خیال نہیں رکھتی، بے جا انھیں ستاتی ہے، میں تجھے جان سے مار دوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے عرشیہ پر حملہ کر دیا۔ عرشیہ زور زور سے چیخنے لگی ''مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔'' مگر گڑیا مسلسل اس پر وار کیے جا رہی تھی۔ اب عرشیہ زور زور سے اپنی امی کو آواز دینے لگی: ''امی بچاؤ! امی بچاؤ! یہ گڑیا مجھے مار ڈالے گی۔'' اچانک عرشیہ کے کانوں میں آواز گونجی: ''بیٹا، بیٹا، آنکھیں کھولو! دیکھو میں تمہارے پاس ہوں۔'' عرشیہ نے آنکھیں کھولیں اور اس نے اپنی امی کو سرہانے دیکھا۔

صبح ہو گئی تھی، سورج کی روشنی کھڑکی کے شیشوں سے چھن چھن کر کمرے میں آ رہی تھی۔ وہ فوراً اٹھی اور کھلونوں کی الماری کی طرف بھاگی جب اس نے دیکھا کہ گڑیا وہیں اپنی جگہ پر موجود ہے تو اسے یقین ہوا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی اور گڑیا ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔

■

Haris Ansari Burhanpuri
277, Ghazi Salar Maidan
Mominpura, Burhanpur - 450331 (MP)

تبسم بی سید عقیل

اچھی باتیں

- دنیا کو خریدنا بے وقوف لوگوں کی تجارت ہے۔
- یہ دنیا ایک مقررہ وقت تک رہے گی اور آخرت ہمیشہ۔
- بادل کی طرح رہو جو پھولوں پر ہی نہیں کانٹوں پر بھی برستا ہے۔
- خود پسندی نعمتوں کی برکت روکتی ہے۔
- مال کا جمع کرنا غم میں پڑنا ہے۔
- گونگا ہونا جھوٹ بولنے سے بہتر ہے۔
- دانا وہ ہے جو اپنے آپ کو پہچانے۔
- مظلوم کی دعا کی قبولیت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔
- بزرگوں کی محفل میں جہاں جگہ پاؤ بیٹھ جاؤ۔
- سب سے اچھا وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔
- صدقہ پروردگار کے غضب کو ختم کر ڈالتا ہے۔

■

Tabassum bi Syed Aqeel
Al-Hasnat Urdu School
Rasulpur (Maharashtra)

محمد ثاقب محمد عارف

حضرت علیؓ کی پیاری باتیں

- ایسی غربت پر صبر کرنا جس میں عزت محفوظ ہو، اس امیری سے بہتر ہے جس میں ذلت و رسوائی ہو۔
- اچھا دوست چاہے کتنا برا بن جائے کبھی اس سے دوستی مت توڑنا کیونکہ پانی چاہے کتنا بھی گندہ ہو جائے آگ بجھانے کے کام آتا ہے۔
- دوستی کی زینت ایک دوسرے کی بات کو برداشت کرنا ہے۔
- کسی کا عیب تلاش کرنے والے کی مثال اُس مکھی جیسی ہے جو سارا خوبصورت جسم چھوڑ کر صرف زخم پر بیٹھتی ہے۔
- اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر مت چلاؤ جس نے تمھیں بولنا سکھایا۔
- لوگ پیار کے لیے ہوتے ہیں اور چیزیں استعمال کے لیے۔ بات اس وقت بگڑتی ہے جب چیزوں سے پیار کیا جاتا ہے اور لوگوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔
- یہ زندگی دو دن کی ہے ایک دن تمھارے حق میں اور دوسرے دن تمھارے خلاف، جس دن تمھارے حق میں ہو اس دن غرور مت کرنا اور جس دن تمھارے خلاف ہو اس دن صبر کرنا۔

■

Mohammad Saquib Mohammad Arif
Qalandariya Urdu Jounior College
Diwan Pura, Mangrul Pir,
Distt: Washim (Maharashtra)

سنہری باتیں

نازنین محمد انس باغوان

- ہر ایک کی سنو اور ہر ایک سے سیکھو کیونکہ ہر کوئی سب کچھ نہیں جانتا لیکن ہر ایک کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔
- شکر ادا کرتے رہا کرو اس رب کا جو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ ضرور دیتا ہے۔
- دنیا کے ہر میدان میں ہار جیت ہوتی ہے لیکن اخلاق میں کبھی ہار اور تکبر میں کبھی جیت نہیں ہوتی۔
- اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کسی سے توقع مت رکھو کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔
- دوسروں کے محل میں غلامی کرنے سے بہتر ہے انسان اپنی جھونپڑی میں حکومت کرے۔
- سچائی اور نیکی کا راستہ دشوار ضرور ہے لیکن منزل بہت خوبصورت ہوتی ہے۔
- بہترین انسان عمل سے پہچانا جاتا ہے ورنہ اچھی باتیں تو دیواروں پر بھی لکھی ہوتی ہیں۔
- دنیا میں ساری چیزیں ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں مگر صرف انسان ہی ہے جو ٹھوکر لگنے کے بعد بنتا ہے۔
- وہ بلندی کسی کام کی نہیں جس پر انسان چڑھے اور انسانیت سے گر جائے۔
- انسان اگر اپنی غلطیوں کا وکیل اور دوسروں کی غلطیوں کا جج بن جائے تو فیصلے نہیں فاصلے ہو جاتے ہیں۔

■

Nazneen Mohd Anas Baghwan
Near State Bank Pachora
Distt: Jalgaon - 244201 (Maharashtra)

روشن سطریں

اویس اختر انصاری

- اپنے حصے کا کام کیے بغیر دعا پہ بھروسہ کرنا حماقت ہے اور اپنی محنت پہ بھروسہ کر کے دعا سے گریز کرنا تکبر ہے۔
- جب انسان سمجھتا ہے کہ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے تب وہ ٹھیک ہونے لگتا ہے۔
- ہر انسان اپنی زبان کے پیچھے چھپا ہے۔ اگر اسے سمجھنا ہے تو اسے بولنے دو۔
- بے شک مشکل وقت بتا کر نہیں آتا، مگر سکھا کر اور سمجھا کر بہت کچھ جاتا ہے۔
- دنیا میں آپ کا حقیقی مقام وہی ہے جس کا اظہار لوگ آپ کی غیر موجودگی میں کرتے ہیں۔
- کسی مضبوط پہاڑ کا اتنا بوجھ نہیں ہوتا جتنا بے قصور پر تہمت لگانے کا بوجھ ہوتا ہے۔
- جو شخص روکھی سوکھی کھا کر بھی مطمئن رہتا ہے وہ سب سے زیادہ دولت مند ہے کیونکہ اطمینان دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔
- بعض لوگ رویے پڑھ لیتے ہیں اور بعض لوگ الفاظ سمجھنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں۔
- والدین کبھی غلط نہیں ہوتے اگر ان سے غلط فیصلے بھی ہو جائیں تو ان کی نیت صاف ہوتی ہے اور انہی کی دعاؤں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔

■

Owais Akhtar Ansari
7th Class, Ansar Iftekhar
Higher Secondry School
Burhanpur (Madhya Pardesh)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

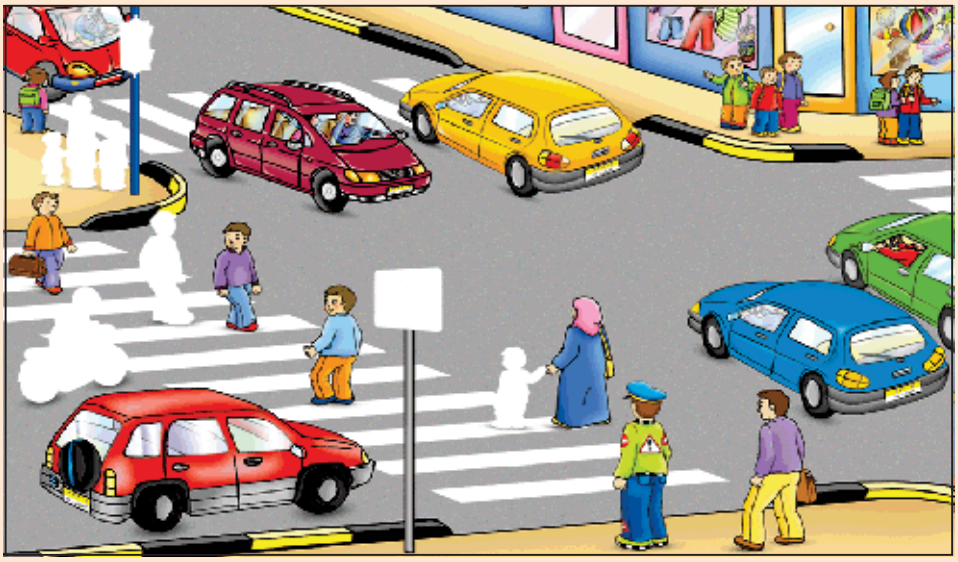

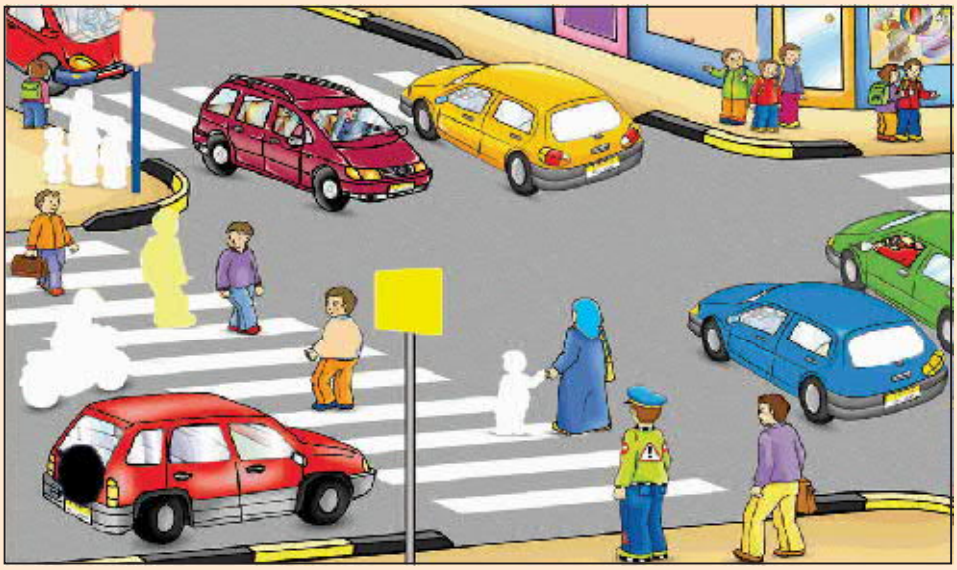

■ جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

ہنسی کے غبارے

ایک آدمی نے تصویر دیکھتے ہوئے مصور سے کہا ''تو یہ ہے وہ خوفناک، وحشت ناک اور دہشت انگیز تصویر جو آپ نے بنائی ہے؟''

مصور بولا ''جناب یہ تصویر کہاں ہے؟ یہ تو آئینہ ہے۔''

ایک کنیز بادشاہ کا بستر بنا رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ بادشاہ کے سونے میں ابھی کچھ وقت ہے، کیوں نہ تھوڑی دیر اس نرم نرم بستر کا لطف اٹھالوں۔ وہ بستر پر لیٹی اور لیٹتے ہی اسے نیند آگئی۔ بادشاہ نے آکر دیکھا تو حکم دیا کہ کنیز کو پچاس کوڑے مارے جائیں۔ کنیز نے کوڑے کھانے کے بعد ٹھنڈی آہ بھری۔

''کیا بات ہے—؟'' بادشاہ نے پوچھا

کنیز کہنے لگی ''چند لمحات اِس بستر پر لیٹنے کی سزا پچاس کوڑے ہے، جو ہر روز اِس پر لیٹتے ہیں ان کا کیا بنے گا''

راہ گیر (بھکاری سے) ''تم سارا دن بھیک مانگتے ہو اور اب رات کو بھی بھیک مانگ رہے ہو؟''

بھکاری نے جواب دیا ''جناب! یہ مہنگائی کا زمانہ ہے، دن رات محنت کرنا پڑتی ہے۔''

بیٹا (ماں سے) ''امی جان! مجھے پانچ روپے دیں مجھے ایک غریب آدمی کو دینے ہیں۔''

ماں نے پوچھا ''وہ آدمی کہاں ہے؟''

بیٹے نے جواب دیا ''امی! وہ گلی کی نکڑ پر کھڑا آئس کریم بیچ رہا ہے۔''

ایک پڑوسی (دوسرے سے) ''احمد صاحب! آپ اپنے بچے کو سمجھالیں۔''

احمد نے پوچھا ''میرے بیٹے نے کیا کیا ہے؟''

پڑوسی ''وہ میری نقل کرتا ہے۔''

احمد ''میں نے اسے ہزار بار منع کیا ہے کہ احمقوں کی نقل مت کیا کرو۔''

دو آدمی ریل میں سفر کر رہے تھے، ان میں سے ایک شخص کے سر پر تھوڑے سے بال تھے۔

دوسرے شخص نے اس سے پوچھا ''بھائی صاحب! آپ کے کتنے بال بچے ہیں؟''

اس آدمی نے جواب دیا ''بس یہی دو چار بچے ہیں۔''

ننھے فنکار

عقل مند راجا

ایک راجا تھا اس کے چار لڑکے تھے۔ جب اس کے لڑکے بڑے ہوئے راجا نے طے کیا کہ جو لڑکا سب سے زیادہ عقل مند ہوگا میں اُس کو راجا بناؤں گا۔ ایک دن اس نے چاروں لڑکوں کو بلایا اور ہر ایک لڑکے کو ایک ایک انار دیا اور کہا کہ اس انار کو ایسی جگہ پر کاٹنا جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو۔ چاروں لڑکے انار لے کر چلے گئے پہلے لڑکے نے انار کو ایک ایسے بند گھر میں کاٹا جہاں کوئی نہیں تھا۔ دوسرے لڑکے نے انار کو زمین کے اندر سرنگ میں جا کر اندھیرے میں کاٹا۔ تیسرے لڑکے نے کالی رات میں اور کالی چادر اوڑھ کر اس انار کو کاٹا۔ چوتھے نے انار کو نہیں کاٹا۔

چاروں لڑکے راجا کے پاس پہنچے اور ہر ایک نے اپنے اپنے انار کے بارے میں بتایا جب چوتھے لڑکے کا نمبر آیا تو اس کا انار جیسے کا ویسا تھا۔ تینوں بھائی اس پر ہنسنے لگے۔ راجا نے اپنے بیٹے سے پوچھا تم نے انار کو کیوں نہیں کاٹا تو اس نے جواب دیا ابا جان جب میں یہ انار ایک اندھیرے کمرے میں کاٹنا چاہا تو مجھے آواز آئی کہ کوئی دیکھ رہا ہے تو میں نے تہہ خانے میں پورے چراغ بند کر کے کالی چادر پہن کر انار کاٹنا چاہا تو آواز آئی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یعنی ابا جان میں جہاں بھی جاتا وہاں میرے دل میں سے آواز آتی ہے کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔ راجا نے کہا بیٹے کون دیکھ رہا تھا، بیٹے نے کہا جہاں بھی رہیں ہم کوئی بھی کام کریں ان سب کو دیکھنے والا خدا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس لیے میں نے اس انار کو نہیں کاٹا۔ راجا کو اپنے چوتھے لڑکے کی بات بہت پسند آئی اور اس کی عقل مندی اور دور اندیشی پر فخر ہوا اور اس کو راجا بنایا گیا۔

■

Maaz Rajey Saheb Qadir Bhai
Zila Parishad, Urdu School, Yachal
Talluqa Rajapur, Distt: Ratnagiri (MS)

ترنم مرزا مشتاق بیگ، بارہویں کلاس، رسل پور، تعلقہ راویر، مہاراشٹر

مسکان مرزا مشتاق بیگ، درجہ: ہشتم، الحسنات اردو ہائی اسکول، تعلقہ راویر، مہاراشٹر

قریشی ثانیہ بھیکن، درجہ: ششم، ڈیڈ پی اردو اسکول، تھالنیر، دھولیہ، مہاراشٹر

اقرا تحسین، مکان نمبر ۸۲۷/۹۰، گلی نمبر ۸۸، یوگیندر پوری، مظفر نگر

محمد حذیفہ، درجہ ہفتم بی، ہیپی پبلک اسکول، نئی دہلی

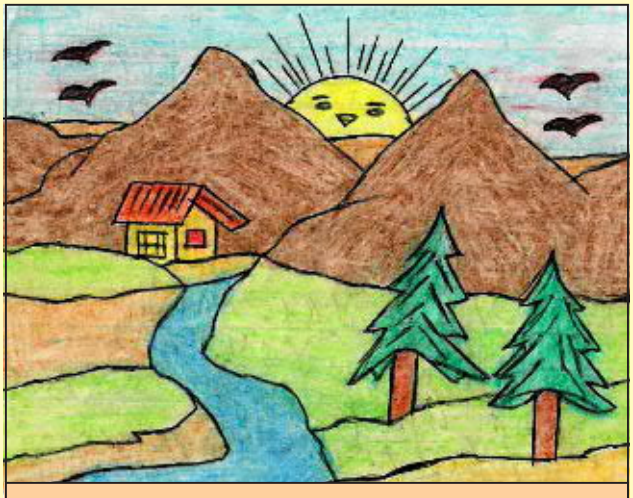

محمد طاہر، درجہ ہفتم، ایس بی وی، نور نگر، نئی دہلی

منیار عظمی زبیر، درجہ سوم، ژیڈ پی اردو اسکول، تھال نیر، دھولے، مہاراشٹر

زاہدہ محمد شریف رنگریز بازار تل، درجہ پنجم، نیشنل اردو ہائی اسکول، برماگاؤں، مہاراشٹر

منیار عرشیہ اسلم، درجہ ششم، ژیڈ پی اردو اسکول، تھال نیر، دھولے، مہاراشٹر

آرزو خان، درجہ: سوم، سکائی رینج اسکول، ناچلانہ کھڑی، جموں وکشمیر

ادیب قادری، درجہ پنجم، دون ویلی پبلک اسکول، دیوبند، ضلع سہارنپور، یوپی

اقرا مشتاق قریشی، درجہ ششم، ژیڈ پی اردو اسکول، تھال نیر، دھولے، مہاراشٹر

facebook اردو فیس بک

ستمبر کا مہینہ یوم اساتذہ کا مہینہ ہے جو آنجہانی ڈاکٹر رادھا کرشنن سے منسوب ہے۔ آج یہ میرا خط بھی آنجہانی ڈاکٹر رادھا کرشنن صاحب جو عظیم فلسفی اور مدبر تھے، انہی سے منسوب ہے۔ انکل جس گھر سے مجھ کو اردو لکھنا پڑھنا آیا وہ ذات ہے مولوی نثار احمد صاحب کی۔ انھوں نے ایک کتاب جو علامہ ظفر ادیبی صاحب مبارکپوری کی لکھی ہوئی ہے، مجھے دی اور کہا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن صاحب کی شخصیت کتنی بلند تھی۔ علامہ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ”آزادی ہند سے پہلے جناب رادھا کرشنن انگلینڈ گئے۔ وہاں ایک فلسفی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بڑی تمکنت سے کہا ”مسٹر رادھا دیکھ رہے ہو ہم نے تیز رفتار کاریں بنائی ہیں اور ہمارے بنائے ہوئے ہوائی جہاز فضاؤں میں پرواز کر رہے ہیں۔ ہم نے ایسے طاقتور جنگی بیڑے تیار کر لیے ہیں جو خوفناک موجوں کو تہہ و بالا کرتے ہوئے اپنی منزل کی سمت رواں دواں ہیں۔“ مسٹر رادھا کرشنن نے اپنے فطری پروقار لہجے میں جواب دیا ”بے شک اہل مغرب تمھیں فضاؤں میں چڑیوں کی طرح اڑنا بھی آ گیا اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرنا بھی آ گیا لیکن افسوس کہ تمھیں زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا۔“

ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ کے لیے اک شعر ہے۔

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے
جو کچھ کہا تو تیرا حسن ہوگیا محدود

ثمیرا راج جائیسوال، کپل دیو سنگھ انٹر کالج، برڈیہہ، مبارکپور، اعظم گڑھ

رسالہ ’بچوں کی دنیا‘ میرا پسندیدہ رسالہ ہے جو کئی سالوں سے زیر مطالعہ ہے۔ پچھلے کچھ مہینوں سے جگہ بدلنے کی وجہ سے نہیں مل پایا۔ اب میرا بیٹا محمد تنویر رضا عرف نورانی دو سال پانچ مہینے کا ہو چکا ہے۔ وہ ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ کے لیے روتا ہے۔ رسالے کے رنگین صفحات جاذب و خوبصورت تصویروں کو دیکھنا بار بار یہ کیا ہے وہ کیا ہے وغیرہ پوچھنا کہنا اس کے عادات میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس کی امی جان ’زیبا خانم‘ جو کہ ماشاء اللہ صوم وصلوۃ کی پابند ہونے کے ساتھ مطالعہ کتب میں مشغول رہتی ہیں وہ خود بھی ’بچوں کی دنیا‘ اول تا آخر بڑے شوق سے پڑھنے کے ساتھ بچے کو بھی سکھاتی پڑھاتی رہتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسالے سے کافی مانوس ہو گیا ہے۔ دوسرے والدین کو بھی اپنے بچوں کو اردو دنیا میں بچوں کی دنیا کے ذریعے لانا چاہیے۔

تنویر رضا عرف نورانی ابن محمد زاہد قادری، رضا مسجد، کھتر کی پورہ، مہاراشٹر

میں عزرم ناز ہوں۔ ’بچوں کی دنیا“ کا پچھلے تین سال سے مطالعہ کر رہی ہوں۔ ہر ماہ اسے پابندی کے ساتھ اپنے استاد ’اشفاق کارنجوی سر‘ کے ذریعے منگواتی ہوں۔ سب سے پہلے یہ رسالہ مجھے میرے استاد اشفاق سر نے ہی انعام میں دیا تھا۔ میں تب ہی سے اسے پسند کرتی ہوں۔

عزرم ناز محمد اعجاز، جی این آزاد اردو ہائی اسکول، بابا پور، اکولہ، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

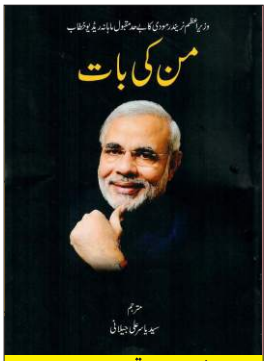

صفحات:550، قیمت: 205 روپے

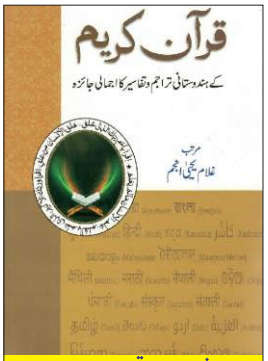

صفحات:604، قیمت: 260 روپے

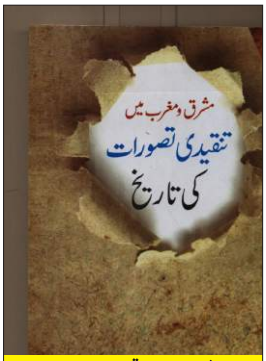

صفحات:373، قیمت:168روپے

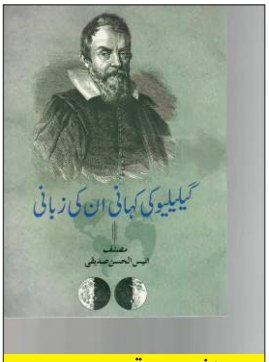

صفحات:37، قیمت:40 روپے

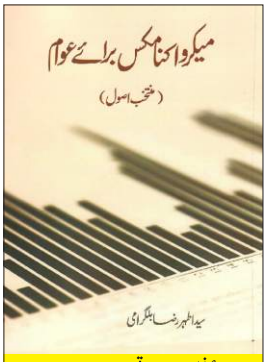

صفحات:196، قیمت: 110 روپے

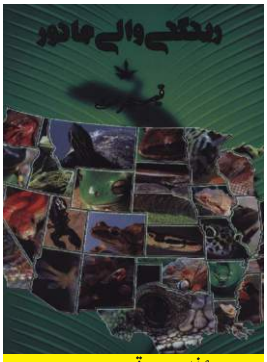

صفحات:84، قیمت: 22 روپے

صفحات:51، قیمت:20 روپے

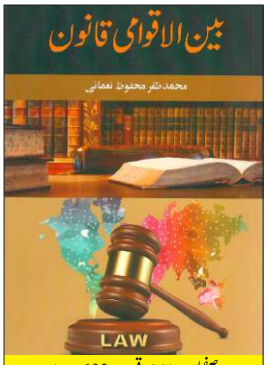

صفحات:264، قیمت: 135 روپے

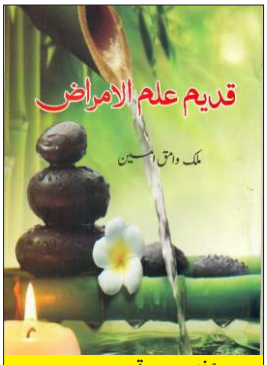

صفحات:131، قیمت:50 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746 فیکس:011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, December 2018, Vol. 06, Issue: 12
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/11/18
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

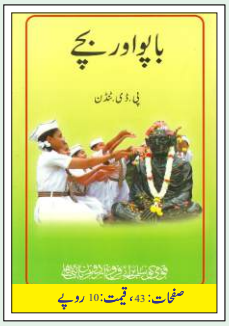

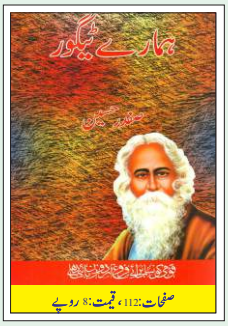

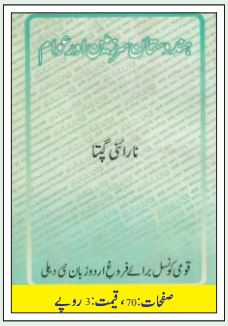

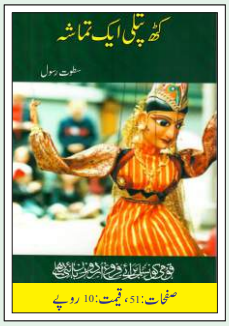

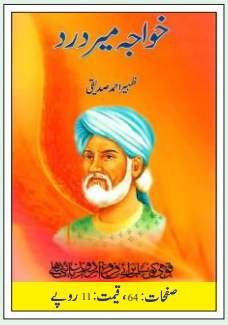

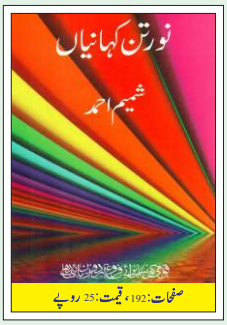

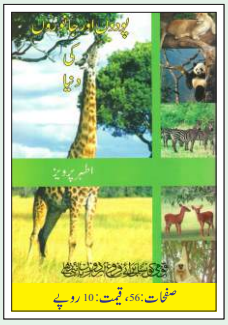

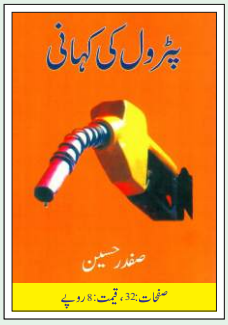

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.